جدید ہندوستان میں

مدارس اور علمی مراکز کی فقہی خدمات

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

ہندوستان میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کا آغاز قطب الدین ایبک کے دورِ حکمرانی (۱۲۰۶-۱۲۱۰ء) میں ہوا۔ اس عہد میں سیکڑوں مساجد، دینی تعلیم وتربیت کے عظیم مراکز تصور کی جاتی تھیں۔ دینیات کی تدریس کا سلسلہ مدارس ومکاتب کے علاوہ صوفیاء کی خانقاہوں میں بھی جاری تھا۔ مثلاً شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (م ۱۳۵۶ء) فقہ میں مہارت وانہماک کی وجہ سے ابوحنیفہ ثانی کہلاتے تھے۔ ۲ اسی طرح شیخ یوسف گدائی اور شیخ رکن الدین فقہ کی تدریس وتصنیف میں مصروف تھے۔ تحفۃ النصائح اور ترفۃ الفقہاء دونوں حضرات کی الگ الگ منظوم کاوشیں ہیں۔ ۳

ہندوستان میں اولین مدرسہ کا ذکر ۱۱۹۱ء میں ملتا ہے، جبکہ محمد غوری (۱۱۷۵-۱۲۰۶ء) نے اجمیر کی فتح کے بعد وہاں ایک مدرسے کی داغ بیل ڈالی۔ ۴ شمس الدین التمش (۱۲۱۰-۱۲۳۵ء) نے بدایوں اور دہلی میں کئی مدارس قائم کئے۔ ۵ خلجی اور تغلق سلاطین کے دور میں بھی علماء کی سرپرستی، مدارس کے لئے شاہی عطیات اور نصابِ کتب کا ریکارڈ موجود ہے۔ ۶ جنوبی ہندوستان میں بھی خالص مذہبی تعلیم کے ساتھ ادب، تصوف اور تاریخ وغیرہ کی تعلیم کا باضابطہ نظم تھا۔ بہمنی سلاطین (۱۳۴۷-۱۵۲۷ء) کی علم پروری نے جنوبی ہند اور شمالی دکن کی معاشرت پر خوش گوار اثرات مرتب کئے۔ ۷ مشرقی ہند کے متعدد مقامات پر مدارس نے ہندو مسلم اتحاد کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈھاکہ، ندیا، رنگ پورہ، لکھنوتی، گوڑ، عمر پور اور بردوان میں مدارس اور عظیم کتب خانے موجود تھے۔ ۸ ان کے علاوہ جو علاقے علم و دانش کی ترویج واشاعت اور مدارس کے قیام اور نظم وانصرام کے لئے معروف رہے

ہیں ان میں بالخصوص سندھ وملتان، دہلی ولاہور، جون پور وگجرات، الٰہ باد ولکھنؤ اور اودھ کے قصبات کا ذکر تاریخی دستاویز میں کثرت سے ملتا ہے۔۹

عہدِ مغلیہ کے کم وبیش تمام ہی سلاطین یا تو خود عالم تھے یا علماء کے قدردان تھے۔ بانیٔ سلطنتِ مغلیہ بابر اپنے ساتھ کتابوں کا ذخیرہ رکھتا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں علوم وفنون کے بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے۔ فرنگی محل کا مدرسہ، جو بعد میں درسِ نظامی کی ترویج واشاعت کا ذریعہ ثابت ہوا، اورنگ زیب ہی کے دور کی علمی یادگار ہے۔

انگریزی عہد مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش کا دور رہا۔ اگرچہ اس دور میں مدارس پر براہِ راست حملہ نہیں ہوا، لیکن ۱۸۳۷ء میں سرکاری زبان کی حیثیت سے فارسی ختم کر دی گئی، مفتیوں اور قاضیوں کے عہدے کالعدم قرار دیے گئے اور بے شمار اوقاف، جو مدارس کے لئے وقف تھیں، ان میں بے جا مداخلتیں شروع کر دی گئیں۔۱۰ چناں چہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے اندر انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ انگریزی زبان کا سیکھنا ناجائز قرار دیا گیا اور فطری طور پر ترقی کے فارمولے کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔۱۱ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مایوسیوں کے اس بھنور سے مسلمانوں کو نکالنے کے لئے ایک طرف سرسید احمد خاں (م ۱۸۹۸ء) نے ۱۸۷۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی، جس نے ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی، دوسری طرف خالص علوم شرقیہ کی بقا و استحکام کے لئے مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۸۷۹ء) نے ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی شکل میں اسلامی قلعے کی تعمیر کی۔ تیسری طرف مولانا محمد علی مونگیری (م ۱۹۲۷ء) نے ۱۸۹۶ء میں مذکورہ دونوں مراجعِ علم وعرفان کے درمیان قدیم وجدید کے سنگم کی شکل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی خشتِ اوّل رکھی۔ یہ تینوں ادارے اپنی نصابی، فکری اور منہجی کمیوں کے باوجود ہندوستانی ملتِ اسلامیہ کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل میں رواں دواں ہیں۔ عہدِ مغلیہ کے زوال تک فارغین مدارس سیاسی، مذہبی اور معاشی اداروں میں روزگار کے اہم عہدوں پر فائز ہوتے تھے، لیکن جوں ہی انگریزی اقتدار نے ہندوستان میں اپنے پنجے مضبوط کئے، غیر مسلم برادرانِ وطن نے

انگریزوں کی حمایت حاصل کر کے، ان عہدوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ انگریزی عہد کے خاتمے اور ہندوستان کی آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد سے آج تک مدارس اسلامیہ ہندوستان کی ترقی کا ذریعہ رہے ہیں۔ ان مدارس نے یہاں کی شرحِ خواندگی میں خوش گوار اضافہ کیا، حکومتِ ہند کو معاشی بوجھ سے بچایا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ علم پروری کا یہ بے مثال کارنامہ اہلِ مدارس نے اپنے مخصوص نظام و منہاج اور اصول و نظریات بنیز ملتِ اسلامیہ کے مالی تعاون کی بنیاد پر انجام دیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں علوم کے تین اہم مراکز تسلیم کئے جاتے ہیں: دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد [۱۲]۔ ان جگہوں پر نصابِ تعلیم میں اشتراک کے باوجود نقطۂ نظر میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ مثلاً دہلی کا مدرسۂ شاہ ولی اللہ علومِ قرآن و حدیث اور سنت کی نشر و اشاعت کو اولیّت دے رہا تھا۔ اس کے نزدیک علومِ عقلیہ کی حیثیت ثانوی تھی۔ لکھنؤ کے علماء فرنگی محل پر ماوراء النہر کے علماء کی ترجیحات غالب تھیں۔ چناں چہ ان کے تتبّع میں فقہ و اصولِ فقہ نے کلیدی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ خیر آباد کے علمی مرکز میں منطق و فلسفہ نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ بقیہ علوم پس منظر میں چلے گئے۔

پیشِ نظر مقالے میں ہندوستان کے سب سے بڑے دبستانِ فقہ (حنفی مکتبِ فکر) کی علمی و فقہی خدمات کا ایک عمومی جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات نے بھی میدانِ فقہ میں قابلِ قدر کام انجام دیا ہے۔ ان کی خدمات کا جائزہ آئندہ انشاء اللہ ایک مستقل مقالے میں لیا جائے گا۔

الف۔ مدارس

۱۔ دارالعلوم دیوبند

انیسویں/بیسویں صدی میں جن مدارس نے فقہ کے میدان میں کلیدی کردار ادا کیا ان میں دارالعلوم دیوبند کا نام سرِفہرست ہے۔ ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/۳۰/مئی ۱۸۶۷ء کو مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۸۷۹ء) نے حاجی سید عابد حسین، مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمٰن کے تعاون سے اس ادارہ کو قائم کیا۔ [۱۳]

اس ادارے نے اپنے قیام کے ابتدائی زمانے ہی سے فقہ واصولِ فقہ پر خصوصی توجہ دی۔ چناں چہ ابتدائی نصاب میں فقہ کی درج ذیل کتب شامل تھیں۔ ان میں سے اکثر آج بھی نصاب کا حصہ ہیں: قدوری، کنز الدقائق، اصول الشاشی، شرح وقایہ، نورالایضاح، ہدایہ اولین واخیرین، حسامی، رسم المفتی، توضیح وتلویح اور مسلم الثبوت ۱۴؎

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ دارالعلوم نے اپنے نصاب میں معاصر تینوں علمی مراکز: دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد سے استفادہ کیا۔ چناں چہ فقہی استدلالات کے لیے قرآن وحدیث میں مہارت وتمرین اور علومِ عقلیہ میں اختصاص اس کے نصاب کی اہم خصوصیت ہے۔ نورالایضاح اور قدوری کے ساتھ ائمہ اربعہ کے اصولِ فقہ سے طلباء کو واقف کرایا جاتا ہے۔ اسی طرح حدیث میں طحاوی کے ساتھ شوافع ومالکیہ کی کتب طلباء کو پڑھائی جاتی ہیں۔ اس ادارے کے فارغین کا ایک معتد بہ حصہ زیادہ تر مساجد ومدارس سے وابستہ ہے اوران کے ذریعہ ہندوستانی عوام کی شرعی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ حلقۂ دیوبند کے جن علماء کرام کو فقہ کے میدان میں نمایاں مقام حاصل ہے ان میں بعض معروف اور ممتاز شخصیات یہ ہیں: مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی عزیز الرحمٰنؒ، قاری محمد طیبؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا انورشاہ کشمیریؒ، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور اب ان کے جانشین مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔

دارالافتاء: اس ادارے میں ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۳ء تک صدر المدرسین مولانا محمد یعقوبؒ انفرادی طور پر افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اسی طرح ۱۸۹۱ء تک یہ خدمت ادارہ کے مختلف اساتذہ نے انجام دی ہے۔ ۱۸۹۲ء میں باضابطہ دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا عزیز الرحمٰنؒ اس کے پہلے مفتی مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں تین کمروں پر مشتمل اس کی الگ عمارت تعمیر ہوئی۔ اس ادارے کا امتیاز رہا ہے کہ آج تک فتاویٰ بلا معاوضہ ارسال کئے گئے ہیں ۱۵؎۔ دارالافتاء سے جو مفتیانِ عظام منسلک رہے ہیں ان میں مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مفتی محمد اعزاز علیؒ، مفتی ریاض الدینؒ، مفتی محمد

سہولؒ، مفتی محمد کفایت اللہ میرٹھیؒ، مفتی محمد فاروق امبیٹھویؒ، مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ اور مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے نام معروف ہیں۔

فتاویٰ کے جو مجموعے انفرادی حیثیت میں شائع ہوئے ہیں، علمی استفسار و اعتبار کی وجہ سے آج بھی خاص طور پر برصغیر کے حنفی سواد اعظم میں مقبول و متداول ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: فتاویٰ رشیدیہ (تین جلدیں) از مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۹۰۵ء) فتاویٰ محمودیہ (اٹھارہ جلدیں) از مفتی محمود الحسنؒ (م ۱۹۹۶ء)، امداد الفتاویٰ (چار جلدیں) از مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۹۴۳ء) نظام الفتاوی (دو جلدیں) از مفتی نظام الدینؒ، کفایت المفتی (نو جلدیں) از مفتی کفایت اللہؒ (م ۱۹۵۲ء)، احسن الفتاوی (سات جلدیں) از مفتی رشید احمد لدھیانویؒ (م ۲۰۰۰ء) یہاں صرف نظام الفتاویٰ کے مندرجات کا سرسری جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس سے بقیہ کی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

فہرستِ فتاوی پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتیٔ مذکور نے کس عرق ریزی سے ان جدید مسائل کا تتبّع کیا ہے جو ان کے زمانہ میں اہم تصور کئے جاتے تھے اور جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔ مثلاً ہندوستان کی زمین عشری ہے یا خراجی؟[۱۶] مغربی ممالک میں رمضان و اوقاتِ نماز کا مسئلہ (۲/ ۱۲۸) سود کے پیسے کا حکم (۲/ ۲۸۶) کمپنی کے شیر زخریدنا اور ساجھے دار ہونا (۲/ ۲۸۲) لائف انشورنس کا حکم شرعی (۲/ ۲۸۶)، ہندی رسم الخط میں قرآن کریم کی اشاعت (۲/ ۳۱۰)، پگڑی کا مسئلہ (۲/ ۳۲۹) غیر مسلم کی شادی و میّت میں شرکت کا حکم (۲/ ۳۷۵)، ہنڈی کے مروّجہ کاروبار میں شرعی حکم (۲/ ۳۹۰) ہندوستان میں بیت المال کا شرعی حکم (۲/ ۳۹۵) مغربی ممالک کے پکے ہوئے گوشت کا حکم جو ڈبے میں آتا ہے [۱۷] لندن میں ثبوتِ رمضان کا حکم (۱/ ۲۳۲)، مشینی ذبیحہ (۱/ ۲۳۹)، خون اور انسانی اعضاء کا استعمال (۱/ ۴۱۹)، پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت (۱/ ۴۶۴) ہوائی جہاز پر نماز ادا کرنے کی صورت (۱/ ۴۷۷) نظام الفتاوی کے ان فتووں میں محض ماضی کی کتبِ فتاویٰ کی طویل عبارتیں نہیں ملیں گی، بلکہ براہِ راست قرآن و حدیث سے

اخذ واستفادہ اور اجتہاد کے ذوق کی جھلک نظر آتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کی بارہ مطبوعہ جلدوں میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بنیادی طور پر آپ کی خدمات پر دارالعلوم کے فتاویٰ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ اسی طرح حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے خلفاء کے فتاویٰ بھی اس ادارے کے فقہی دبستان میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً مفتی محمد شفیعؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ وغیرہ۔ اس کی پہلی جلد مرتب کے نام پر عزیز الفتاوی کے نام سے معروف ہوئی، جب کہ دوسری جلد مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ کے فتاوی پر مشتمل ہے اور یہ امداد المفتیین کے نام سے شائع کی گئی ۱۸

۲۔ مظاہرِ علوم سہارن پور:

یہ عظیم ادارہ ہندوستان میں فقہ حنفی کی تدریس اور فتاویٰ کی ترسیل وتالیف اور تربیت کا دوسرا بڑا مرکز ہے۔ دارالعلوم کے قیام کے چھ مہینہ بعد یکم رجب ۱۲۸۳ھ/ ۹ رنومبر ۱۸۶۶ء کو اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا سلامت علیؒ اس ادارے کے بانی شمار کیے جاتے ہیں ۱۹۔ دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ ادارہ بھی اپنے زمانۂ قیام سے شرعی معاملات ومسائل میں شغف وانہماک کے لیے معروف رہا ہے۔ اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ فارغین کے اندر فقہی گہرائی کی بنیاد اس کی درسی کتب ہیں۔ یہاں فقہ واصولِ فقہ میں مہارت وبصیرت، ائمہ اربعہ اور خاص طور پر ائمہ ثلاثہ کے استدلالات واستدراکات سے واقفیت پیدا کرنے کی استعداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ مظاہرِ علوم کی ابتدائی درسی کتب کا بڑا حصہ آج بھی شاملِ نصاب ہے مثلاً: ہدایہ، درمختار، توضیح وتلویح، اصول الشاشی، سراجی، نورالانوار، شرحِ وقایہ، قدوری اور منیۃ المصلی ۲۰۔ مظاہرِ علوم مدارسِ اسلامیہ ہند کی فہرست میں اس اعتبار سے ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے کہ حکومتِ ہند کی مسلم دشمنی، اسلامی ثقافت پر حملہ اور اسلامی روایات پر نکتہ چینی کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہا ہے۔ چنانچہ خلافت تحریک کے زمانے میں خلافت کمیٹی کے ارکان کی زبردستی گاؤکشی پر پابندی کے خلاف جدّ وجہد اور مولانا

خلیل احمدؒ کا فتویٰ بابت حرمتِ ترکِ ذبیحہ ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ اسی درس گاہ کی کوششوں سے کان پور، پھلواری شریف اور سہسرام میں قضاۃ کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۲۹ء میں ''شاردا بل'' کے خلاف جدّوجہد کی گئی۔ اس بل کے ذریعے حکومت نے اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکی اور اکیس سال سے کم عمر لڑکے کی شادی کو قانوناً ممنوع قرار دیا تھا۔ چناں چہ مولانا سید عطاء اللہ مظاہریؒ نے ہزاروں نابالغ مسلمانوں بچوں کا نکاح پڑھا کر اس قانون کو کالعدم قرار دینے کی کوشش کی [۲۱]

فقہ کے عمومی اور روایتی مسائل ومعاملات کے ساتھ منتخب عناوین پر بھی فضلاءِ ادارہ نے تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔ مثلاً اسلامی مملکت میں غیر مسلم شہریوں کے حقوق (انیس الرحمٰن لدھیانوی)، رفع الخلاف عن حکم مونوگراف (ضیاء احمد گنگوہی)، فتویٰ گاؤکشی (حبیب احمد کیرانوی)، نوٹ کی حقیقت اور اس کے شرعی احکام، الکحل آمیز ادویہ اللہ کی شریعت میں (سعید احمد اجراڑوی)۔ فقہی کتب کی ایک فہرست سید محمد شاہد سہارن پوری نے اپنی کتاب ''علماء مظاہرِ علوم اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات'' میں تیار کی ہے۔ اس فہرست سے ادارہ کے فارغین کی مطبوعہ فقہی کتب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ البتہ اس فہرست میں صرف ۱۹۸۳ء تک شائع ہونے والی تصنیفات کا ذکر ہے۔

دارالافتاء مظاہرِ علوم : ابتدائی زمانہ میں مولانا ثابت علیؒ، مولانا عنایت الٰہی سہارن پوریؒ، مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ اور مولانا عبدالوحید سنبھلیؒ انفرادی طور پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ لیکن جب استفتاء کی کثرت ہونے لگی تو اس کا باقاعدہ نظم قائم کیا گیا اور محرم الحرام ۱۳۳۸ھ/ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے اولین مفتیٔ اعظم مولانا محمد ممتاز خان ٹانڈویؒ قرار پائے [۲۲]۔ مظاہرِ علوم کے فتاوی جس رجسٹر میں درج کئے جاتے ہیں اس کا نام فتاویٰ مظہریہ ہے۔ یہ رجسٹر پچیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور تینتیس ہزار نوسو نوّے (۳۳۹۹۰) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۷۷ء تک جو فتاویٰ تحریری طور پر بھیجے گئے ان کی تعداد اٹھتر ہزار چوراسی (۷۸۰۸۴) ہے۔ یہ تمام فتاویٰ جامعۃ الرشاد سہارن پور، ماہنامہ جامعہ

نظام کان پور، ماہنامہ المظاہر سہارن پور وغیرہ میں بڑے اہتمام سے شائع کیے جاتے رہے ۲۳۔ مظاہر علوم کے کچھ فتاوی ''فتاویٰ خلیلیہ'' کے نام سے دو جلدوں میں ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکے ہیں ۲۴۔

۱۹۱۹ء سے اب تک جن مفتیانِ کرام نے دارالافتاء سے فتاویٰ ارسال فرمائے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں: مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ (م ۱۹۵۷)، حافظ ضیاء احمد گنگوہیؒ (م ۱۹۵۶ء) قاری سعید احمد اجاڑویؒ (م ۱۹۵۷ء) مولانا رشید احمد سلہٹیؒ، مولانا ظہور الحسن کولویؒ (م ۱۹۷۸ء) مولانا محمود الحسن گنگوہیؒ مولانا مظفر حسن اجراڑوی، مفتی یحییٰ، مفتی عبدالعزیز اور مفتی عبدالقیوم وغیرہ ۲۵۔

۳۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

قدیم وجدید کا سنگم دارالعلوم ندوۃ العلماء دراصل اس احساس کے تحت وجود پذیر ہوا کہ آج کی دینی اور علمی ضرورت نہ علی گڑھ (مسلم یونیورسٹی) سے پر ہوسکتی ہے اور نہ دارالعلوم دیوبند سے۔ اس مقصد کے لیے اس نصاب میں عربی ادب، تاریخ، تفسیر، حدیث، سیاسیات، انگریزی، ریاضی اور سائنس کے بعض مضامین کا شامل کیا جانا ضروری تھا۔ ندوہ کے نصاب میں فقہی کتب کی شمولیت اس حد تک ہے کہ طلبہ فقہاءِ اربعہ کے اصول ومبادی اور ان کے اختلافات سے واقف ہوجائیں۔ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ (م ۱۹۲۷ء) نے مدرسہ فیضِ عام کان پور میں ۱۸۹۳ء میں علماءِ ہند کی ایک اہم میٹنگ طلب کی اور وہیں 'ندوہ العلماء' کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل فرمائی۔ بعد میں ۱۸۹۶ء میں ان کے ہاتھوں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سنگِ بنیاد لکھنؤ میں رکھا گیا ۲۶۔ ندوہ نے اپنے بنیادی مقاصد کے مطابق اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اہم کارنامے انجام دیے۔ متعدد علماءِ ندوہ نے فقہ اسلامی کو بھی اپنی تحقیقی وتصنیفی کاوشوں کا موضوع بنایا اور بعض نے اس باب میں مستشرقین کے اعتراضات واشکالات رفع کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ مولانا شبلی فقیہؒ، مولانا محمد اسباطؒ، مولانا محمد اسحٰق سندیلویؒ وغیرہ کے اسماء گرامی قابلِ اعتبار سمجھے جاتے

ہیں۔مولانا سید سلیمان ندویؒ (م۱۹۵۳ء) کی عصری مسائل سے دلچسپی اوران میں بصیرت جدید اصحابِ نظر کے یہاں بھی مسلّم تھی۔چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اجماع و قیاس اور ناسخ ومنسوخ پر آپ کی آراء سے استفادہ کیا۔مولانا سید سلیمان ندویؒ سے علامہ اقبالؒ کے کسب کا عکس ان کی اہم تالیف The construction of Religious Thought in Islam میں نظر آتا ہے۔فقہی بصیرت کی بنا پر جمعیۃ علماء ہند نے اسلامی قانون کے ماہرین کی فہرست میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کو نمایاں مقام عطا کیا۲۷۔۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کی قیادت آپ نے لندن جا کر فرمائی۔

فقہ کے میدان میں آپ کی متعدد کتب سند کا درجہ رکھتی ہیں،مثلاً عکسی تصاویر کے جواز کی شرعی حیثیت ،حیاتِ امام مالکؒ،حقیقت الحج۔ان کتب کے علاوہ آپ کے بہت سے فقہی مقالات دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ترجمان ماہنامہ معارف میں شائع ہو چکے ہیں۔نیز سیرت النبی کے وہ اجزاء،جن کا تعلق شریعتِ اسلامی کی تشریح وتعبیر اور قانونِ اسلامی کی تفہیم سے ہے،ان میں سید صاحب ماہر قانون داں اور صاحبِ بصیرت عالم نظر آتے ہیں۔یہاں بعض دیگر ندوی فضلاء کی فقہی کتب اور علمی کاوشوں کا ہلکا سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔مولانا عبدالسلام ندویؒ نے القضاء فی الاسلام لکھ کر قانونِ عدالت کے موضوع پر اردو میں خلا کو پر کیا۔مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (م۱۹۹۹ء) نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے ذریعہ اسلامیانِ ہند کی رہبری فرمائی۔مسلم مجلسِ مشاورت اور ملی کونسل جیسے معتبر اداروں کے کلیدی مناصب پر فائز ہونے کے بعد علماء ودانش ورانِ قوم کو متحدہ پلیٹ فارم پر لانے کا بیڑا اٹھایا۔ شریعتِ اسلامی کے مختلف گوشوں کی حفاظت وصیانت اور انہیں شک وریب کے بھنور سے نکالنا، ہندی مسلمانوں کے مذہبی تشخص کی پاسبانی کرنا ،فقہ اسلامی کی ایسی خدمت ہے جو تصنیفی خدمات سے کسی طور پر کم اہم نہیں۔فقہ سے متعلق مولانا کی خاص تصنیف ’ارکانِ اربعہ‘ ہے۔آپ کے کلیدی خطبات،جو مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلسِ مشاورت اور ملی کونسل کے علاوہ دیگر تنظیموں اور انجمنوں کے پلیٹ فارم سے شائع ہوئے ،ان میں آپ کی فقہی بصیرت کے بے شمار گوشے تحقیق ومطالعہ کا

موضوع بن سکتے ہیں۔مولانا رئیس احمد جعفری ندویؒ نے سیرتِ ائمہ اربعہ تصنیف کی۔ آپ نے ڈاکٹر ابوزہرہؒ کی بعض عربی کتب: مثلاً آثارِ امام شافعیؒ، حیاتِ امام احمد بن حنبلؒ، امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا۔مولانا مجیب اللہ ندوی نے اپنے لیے فقہی موضوعات کو میدانِ تحقیق بنایا۔آپ کی چند اہم کتابیں یہ ہیں: اسلامی فقہ (تین جلدیں)، اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام، فتاویٰ عالم گیری اور اس کے مؤلفین، اسلامی قانونِ اجرت، ثبوتِ رجم، فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل۔ نیز ماہنامہ الرشاد کے فقہی مقالات اور استفتاء کے جوابات وغیرہ۔مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری ندویؒ نے فقہ کے بعض اہم گوشوں سے بحث کی، مثلاً اجتہادی مسائل، مسئلہ تعدّدِ ازدواج، چند ازدواجی مسائل، اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی، کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت، اسلام اور موسیقی وغیرہ۔

ان مؤلفین کے علاوہ کچھ دیگر فضلاءِ ندوہ کی کتب کا حوالہ بھی مناسب ہوگا۔شافعی فقہ (دوجلدیں، مولانا محمد ایوب ندوی) ہماری فقہ (مولانا سراج الدین ندوی)، قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب (مولانا مختار احمد ندوی) وغیرہ۔بعض فضلاءِ ندوہ نے فقہی کتب کو دیگر زبانوں سے اردو میں منتقل کر کے نہ صرف یہ کہ اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے، بلکہ فقہ وفقہیات کی ترسیل کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔مثلاً مولانا عبدالسلام ندویؒ (م۱۹۵۶ء) نے مولانا سلامت علی خان کی فارسی تصنیف ''کتاب الاختیار'' کا ترجمہ اسلامی قانونِ فوجداری کے نام سے کیا۔یہ کتاب قضاۃ ومفتیانِ کرام کے لیے بہت مفید ہے۔تمام قضیے نمبروار درج کیے گئے ہیں۔اسی طرح انہوں نے شیخ محمد الخضریؒ کی عربی تصنیف کا ترجمہ 'تاریخِ فقہِ اسلامی' کے نام سے کیا۔ یہ اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے۔سید سعید اصغر ندوی نے جلال الدین تھانیسری کی کتاب ''تحقیق آراضیٔ ہند'' کا اردو ترجمہ کیا۔اس کتاب کے ذریعہ ہندوستان کی قدیم زمینوں، راجاؤں کی متروکات اور متنازعہ زمینوں کے مسائل حل کیے گئے ہیں۔مولانا مختار احمد ندوی نے علامہ یوسف القرضاوی کی عربی تصنیف **الحلال والحرام فی الاسلام** کو سلیس اردو کا جامہ پہنایا۔مولانا اشہد رفیق

ندوی (عربی ٹیچر 2+10 اے، ایم، یو علی گڑھ) نے انسائیکلوپیڈیا آف عقائد اینڈ فقہ کے نام سے ایک مبسوط کتاب تیار کی ہے، جو منتظرِ طباعت ہے۔

دارالافتاء ندوۃ العلماء لکھنؤ: مجلس تحقیقاتِ شرعیہ کے اجلاس منعقدہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۶۵ء میں دارالافتاء ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی پہلی نشست مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی زندگی میں ۱۸۹۵ء میں ہوئی، جس میں مولانا عبدالحق حقانیؒ اور شاہ سلیمان پھلواریؒ نے تائید میں تقریریں کیں اور گیارہ دفعات پر مشتمل محکمۂ افتاء کا خاکہ پیش کیا گیا[۲۸]۔ آغاز میں مفتی ظہور قاسمیؒ فتاویٰ تحریر فرماتے تھے، لیکن ۲۹ر جولائی ۱۹۰۰ء میں مجلسِ انتظامیہ نے، جس میں علامہ شبلی نعمانی موجود تھے، یہ کہہ کر دارالافتاء ختم کر دیا کہ علماء انفرادی طور پر فتاویٰ دے لیتے ہیں، نیز دوسرے مدارس میں دارالافتاء قائم ہیں، لہٰذا اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مولانا فاروق چریاکوٹیؒ دارالافتاء کے مفتی بنائے گئے تھے، چناں چہ اس کے بند ہونے کی وجہ سے آپ اس سے سبک دوش ہو گئے، البتہ مولانا خلیل الرحمٰن سہارن پوریؒ اس کے مہتمم بنا دیے گئے[۲۹]۔ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے دو جید فضلاء کی خدمات اس دارالافتاء کو حاصل ہیں: ایک مولانا عتیق احمد بستوی قاسمی اور دوسرے مولانا برہان الدین سنبھلی قاسمی۔ اس دارالافتاء کا کوئی مجموعہ طبع نہیں ہوا ہے۔

۴۔ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ:

مولانا محمد شفیعؒ (م۱۹۴۵ء) نے ۱۹۰۸ء میں سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد ڈالی۔ اس مدرسہ نے علامہ شبلی نعمانی (م۱۹۱۴ء) پھر علامہ حمید الدین فراہیؒ (م۱۹۳۰ء) کی کوششوں سے ایک عظیم تعلیمی مرکز کی شکل اختیار کر لی[۳۰]۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد بنیادی طور پر ملتِ اسلامیہ کے فکر و عمل میں قرآن کو مرکزی مقام عطا کرنا ہے۔ یہاں نئے اسلوب و پیرایہ میں قرآن کے مطالعہ کی سعی کی جاتی ہے۔ قرآن کو قرآن سے سمجھنا، اس کے داخلی نظام کو دریافت کرنا اور قرآن کو مرتب و منظم صحیفۂ الٰہی کی حیثیت سے طلباء کے ذہن و دماغ میں اتارنا اس ادارہ کا کارنامہ

ہے، جو اسے برّصغیر ہندو پاک کے دینی اداروں میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ قرآن کو نصاب کا محور بنا کر اس ادارہ نے حدیث وفقہ اور دیگر اسلامی علوم کے مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے نصاب میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کی بھی رعایت نظر آتی ہے، چنانچہ علم سیاسیات، انگریزی ادب، ریاضی، جغرافیہ وغیرہ بھی داخلِ نصاب ہیں۔ فقہ کے میدان میں کسی ایک فقہ کی پابندی کی جگہ ''فقہ مقارن'' کے مطالعہ کو اہمیت دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ابن رشد قرطبیؒ کی ''بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد'' شاملِ نصاب رہی ہے۔ جن فضلاءِ مدرسہ نے فقہ کے میدان میں علمی خدمات انجام دیں ان میں سب سے نمایاں نام مشہور مفسرِ قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م ۱۹۹۷ء) کا لیا جاسکتا ہے۔ آپ نے تشکیلِ پاکستان کے بعد عائلی کمیشن پر ایک جامع رپورٹ تحریر فرمائی، جس سے حکومتِ پاکستان نے قانون سازی میں استفادہ کیا۔ آپ کی فقہی تصنیفات یہ ہیں: اسلامی قانون کی تدوین، اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق، اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل، پردہ اور اسلام وغیرہ۔ اس کے علاوہ تدبرِ قرآن کے ہزاروں صفحات پر بکھری ہوئی آپ کی فقہی آراء تحقیق کا موضوع بن سکتی ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح کے دوسرے بالغ نظر اور نابغۂ روزگار عالم باعمل مولانا ابواللیث اصلاحیؒ ندوی نے اپنی پوری شعوری زندگی ملتِ اسلامیہ ہند کی دینی وملی رہنمائی میں کھپادی۔ آپ کی فقہی آراء کا مطالعہ ماہنامہ زندگی رامپور اور روزنامہ وسہ روزہ دعوت دہلی کے مضامین اور مختلف صدارتی خطبات میں کیا جاسکتا ہے۔ نشہ بندی اور اسلام آپ کی مستقل فقہی تصنیف ہے۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی نے اپنی کتابوں 'فقہ اسلامی' اور 'آسان فقہ' (دو جلدیں) میں آسان زبان میں تمام عمومی مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ آپ کی ایک کتاب ''حج اور اس کے مسائل'' کے نام سے ہے۔ عورتوں کے مسائل پر آپ نے خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ماہنامہ ذکریٰ رام پور میں فقہی سوالات کے جوابات آپ کی فقہی مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی (ریڈر شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی) نے معاشیات کے میدان کو منتخب کیا اور بلاسودی بینکنگ سسٹم کو علمی وعقلی

دلائل سے مبرہن کیا۔ آپ کی کتاب ''شیئر بازار میں سرمایہ کاری: موجودہ طریقہ کار اور اسلامی نقطۂ نظر'' اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے۔ یہ کتاب ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ نے شائع کی ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سمیناروں میں علمی مقالات کے ساتھ آپ کی شرکت سے ایک طرف مدرسۃ الاصلاح کی نمائندگی ہوتی ہے، وہیں آپ کی شخصیت مسلم یونیورسٹی کے لائق فرزند اور محقق استاد کی حیثیت سے بھی دادِ تحسین حاصل کرتی ہے۔ مولانا عبدالعلیم اصلاحی نے دارالحرب اور دارالاسلام اور جہاد کے عنوان پر مستقل رسائل لکھے ہیں۔ آپ کے خیال میں ہندوستان کی شرعی حیثیت دارالحرب کی ہے۔ آپ کی اس اجتہادی فکر سے بالغ نظر علماء کو شدید اختلاف ہے۔

بعض فضلاءِ مدرسۃ الاصلاح نے فقہ کی خدمت موازنہ وتجزیہ کے ذریعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی (ریڈر شعبۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے مختلف مسلم ادوار، بالخصوص عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی فقہ سے دلچسپی لی ہے اور معاصر مسائل کا تفصیلی تعارف اپنی کتابوں اور مقالات میں کرایا ہے۔ اردو اور انگریزی میں آپ کی تحریریں حوالہ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ 'اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ۔ عہدِ فیروز شاہی کے ہندوستان میں'، 'سلاطینِ دہلی اور شریعتِ اسلامیہ۔ ایک مختصر جائزہ' اور 'Socio Economic Dimension of Fiqh Literature in Medevel India' آپ کی اہم تصانیف ہیں۔ بعض اصلاحی فضلاء نے فقہ کی خدمت ترجمہ کے ذریعہ انجام دی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالمجید اصلاحی نے ڈاکٹر عبدالمنعم کی عربی کتاب کا ترجمہ ''نظامِ زکوۃ'' کے نام سے کیا۔

ندوۃ العلماء کی طرح، مدرسۃ الاصلاح میں بھی دارالافتاء کے قیام کی ضرورت بانیانِ مدرسہ نے محسوس نہیں کی۔ البتہ وقتاً فوقتاً بعض اساتذہ انفرادی طور پر فتویٰ تحریر کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن بیش تر معاملات ومسائل میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی طرف مستفتیوں کی رہنمائی کر دی جاتی ہے۔

۵۔ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ:

ابتدائی طور پر یہ ایک مکتب تھا۔ ۱۹۶۰ء میں اس کا نام جامعۃ الفلاح تجویز کیا گیا۔ مولانا ابوبکر اصلاحی (م ۱۹۹۸ء) اور مولانا شبیر احمد اصلاحی اس کے بانیان و معمارانان میں شمار کئے جاتے ہیں۔

جامعۃ الفلاح میں درس و تدریس کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی جاتی ہے کہ امتِ مسلمہ کے مزاج و مسائل سے طلبہ کو واقف کرایا جائے اور ہندوستان کے کثیر مذہبی معاشرہ میں داعیانہ کردار ادا کرنے کی انہیں صلاحیت بہم پہنچائی جائے۔ [۳۱] جامعۃ الفلاح کے نصاب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید و قدیم کا خوب صورت سنگم ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، عقائد، منطق وفلسفہ، سیاسیات و معاشیات، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، جغرافیہ، ریاضی اور سائنس کی بنیادی معلومات اس میں شامل ہیں۔

فقہ اسلامی اس ادارے کے نصاب کا اہم حصہ ہے۔ چنانچہ عربی درجات کے آغاز سے انتہائی درجات تک فقہ کی باضابطہ تدریس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حنفی الاصل ہونے کے باوجود فقہائے ثلاثہ کی تعظیم وتوقیر، ان کے افکار عالیہ سے اخذ و استفادہ اور طلبہ واساتذہ کی عملی زندگی میں توسّع پسندی اس کے بنیادی امتیازات ہیں۔ چناں چہ اقامتی زندگی میں اہل حدیث، مالکی، شافعی اور حنبلی فکر ونظر کے اساتذہ و طلباء کامل اتحاد کے ساتھ علوم ومعارف کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف رہتے ہیں۔

جامعۃ الفلاح میں باضابطہ دارالافتاء کبھی قائم نہیں ہوا۔ اساتذہ میں انفرادی طور پر مولانا ابوبکر اصلاحیؒ، مفتی عبدالرؤف اور مولانا محمد طاہر مدنی یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ فارغینِ جامعہ کی انتہائی قلیل تعداد نے فقہ وفتویٰ نویسی کو اپنی دل چسپی کا موضوع بنایا۔ مفتی محمد صباح الدین فلاحی قاسمی نے اس میدان کو اپنے لئے مخصوص کیا۔ ملکی و بین الملکی سمیناروں میں فقہی مقالات کے ساتھ شرکت کی۔ مؤقر مجلّات میں آپ کے مقالات شائع ہوئے اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمیناروں

میں اربابِ نظر نے آپ کی پذیرائی فرمائی۔ آپ کے چند مطبوعہ مقالات یہ ہیں: مشینی ذبیحہ کی شرعی حیثیت، اجماع۔ ایک تحقیقی بحث، اختلافِ مطالع اور فلکی حساب، رؤیت ہلال، فقہاء کے درمیان اختلاف کے اسباب، انصراف بعد التسلیم وغیرہ۔ جامعہ الفلاح کے بعض فارغین نے ترجمہ کے ذریعہ فقہ کی خدمت انجام دی۔ مثال کے طور پر مولانا محمد عبدالحی نے ڈاکٹر عبدالحمید احمد ابوسلیمان کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ''اسلام اور بین الاقوامی تعلقات۔ منظر اور پس منظر'' کے عنوان سے کیا۔ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی نے علامہ ابن رشد قرطبیؒ کی مشہورِ زمانہ کتاب **بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد** کو اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ ترجمہ ابھی منظرِ اشاعت ہے۔ فقہ اور متعلقات فقہ پر اردو اور عربی میں ہندوستان میں جو کچھ کام ہوا ہے، راقمِ سطور نے اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالوں میں اس کا تعارف کرایا ہے۔ اس ضمن میں متعدد مقالات سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد، سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ، سہ ماہی اسلام اور عصر جدید نئی دہلی اور شعبۂ علوم اسلامیہ اے، ایم، یو، علی گڑھ کے اردو اور انگریزی مجلّات میں شائع ہوئے ہیں۔ اور انگریزی زبان میں ایک کتاب منظر عام پر آچکی ہے۔ اس کا عنوان ہے Indian Contribution to Figh Literature - A critique of Arabic works upto 1857

ب: ادارے

دینی مدارس کے ساتھ دیگر تعلیمی و تحقیقی مراکز اور اداروں نے بھی فقہ کے میدان میں قابلِ قدر حصہ لیا ہے۔ ذیل میں ان کا تعارف کرایا جائے گا۔

ا۔ فیکلٹی آف دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ:

مسلم یونیورسٹی میں ایک الگ ادارے کے تحت جلیل القدر علماء کرام کے ذریعہ دینی تعلیم کے لیے کوششیں سرسید علیہ الرحمۃ کی زندگی ہی میں شروع ہوگئی تھیں۔

اس کمیٹی میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ شامل کیے گئے اور مولانا نانوتویؒ کے داماد مولانا عبداللہ انصاریؒ اس شعبے کے پہلے ناظم مقرر کئے گئے۔۳۲ ان کی ذاتی صلاحیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے سرسیدؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا: ''اگر اللہ قیامت کے دن مجھ سے پوچھے گا کہ کیا لائے ہو تو میں عبداللہ انصاری کو پیش کردوں گا''۳۳

فیکلٹی آف دینیات مسلم یونیورسٹی کی قدیم ترین فیکلٹیز میں سے ہے، سرسیدؒ کے زمانہ ہی سے دینیات کی تعلیم ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے دی جاتی رہی ہے۔ ایم اے او کالج کے دستور میں یہ صراحت دفعہ ۱۷۰ کے تحت موجود ہے کہ ''کل مسلمان بورڈروں کو پنج گانہ نماز کا ادا کرنا اور رمضان میں بجز حالتِ عذر معقول کے روزوں کا رکھنا اور جن بورڈروں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہوا ہو ان کو مقررہ گھنٹوں میں قرآن مجید پڑھنا لازم ہوگا۔''۳۴

مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کی ضرورت کا احساس سرسیدؒ کے اس خط میں ملتا ہے جو انہوں نے علامہ شبلیؒ کو لکھا تھا: ''بہت سی خامیوں کے باوجود جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل ہمیشہ اس کی سالانہ رپورٹ میں چھپتی ہے، ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود نہیں''۳۵ دوسرے ناظم مولانا ابوبکر شیث جونپوریؒ کے بعد علی الترتیب مفتی محمد شفیع فرنگی محلیؒ، مولانا وصی علی ملیح آبادیؒ، مولانا مفتی محمد حفیظ اللہؒ اور مولانا تقی امینیؒ ناظم دینیات مقرر ہوئے۔ پروفیسر عبدالعلیم خان اور ڈاکٹر اسد اللہ نے ایک سال (۸۷-۱۹۸۶ء) کے لیے یہ ذمہ داری سنبھالی اور ۱۹۸۸ء سے تاحال ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی اس عہدہ پر فائز ہیں۔ مولانا محمد سلیمان اشرفؒ کے بعد مولانا عبداللطیف رحمانیؒ شعبۂ دینیات کے صدر مقرر ہوئے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کا زمانۂ صدارت اس اعتبار سے اہم ہے کہ آپ کے زمانہ میں اس شعبہ کے طلبہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ۱۹۷۲ء میں آپ کے سبکدوش ہونے کے بعد قاضی مظہر الدین بلگرامی صدر مقرر ہوئے۔ آپ کے بعد علی الترتیب قاری محمد رضوانؒ، ڈاکٹر فضل الرحمان گنوری، مولانا

تقی امینیؒ، ڈاکٹر رؤفہ اقبال، پروفیسر عبدالعلیم، ڈاکٹر نسیم منصور، پروفیسر زین الساجدین اور ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی صدرِ شعبہ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

شعبۂ دینیات کے مختلف اساتذہ نے فقہِ اسلامی کے موضوع پر علمی و تصنیفی کام کیا ہے۔ مولانا عبداللہ انصاریؒ نے ''عقائدِ اسلام'' تالیف فرمائی۔ اس کتاب میں مولانا نے شیخ العلماء ظاہر بن صالح الجزائری کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کے ساتھ بعض مضامین کا اضافہ کیا ہے۔ مولانا عبداللطیف رحمانیؒ نے 'تذکرۂ امام اعظمؒ' تالیف کی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ [۳۶] ایک درجن سے زائد کتب کے مؤلف ہیں۔ آپ کی اہم کتابیں یہ ہیں: ہندوستان کی شرعی حیثیت، اسلامی عبادات اور اخلاقی تعلیمات، اسلام میں غلامی کی حقیقت، کتاب دینیات برائے امتحان بی اے، بی کام، بی ایس سی۔ یہ کتاب ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ مولانا تقی امینیؒ نے اپنے زمانۂ نظامت (۱۹۶۴-۱۹۸۶ء) میں تدریس و تالیف کے ذریعہ فقہ اور متعلقاتِ فقہ کی بڑی خدمت انجام دی۔ آپ کی فقہی کتب کے نام یہ ہیں: اجتہاد کا تاریخی پس منظر، احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، اسلام کا زرعی نظام، مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر۔ آپ نے جو فتاویٰ صادر فرمائے وہ 'مراسلات' کے نام سے ایک جلد میں فیکلٹی آف دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں مسلم پرسنل لا کے مسائل، جدید مذبح خانہ، الیکٹرک شاک، پراویڈنٹ فنڈ، دارالاسلام و دارالحرب، انگریزی الفاظ کا استعمال جیسے جدید مسائل کے سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ [۳۷] مولانا فضل الرحمٰن گنوری نے ''تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے'' کے موضوع پر ایک مبسوط کتاب تصنیف فرمائی۔ تعددِ ازواج کے عنوان سے آپ کا مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسن خان (م ۱۹۹۴ء) نے طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر نصابِ دینیات کے نام سے دو حصوں میں ایک کتاب تیار کی، جو ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ موجودہ ناظمِ دینیات ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی بھی فقہ و متعلقاتِ فقہ کی

تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی کتاب ''اعتدال۔ اسلامی شریعت کا مزاج'' کسی حد تک اصولِ فقہ سے بحث کرتی ہے۔ آپ نے قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی فقہی بصیرت پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا ہے، جو منتظرِ طباعت ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کے سمیناروں میں بھی آپ کی سرگرم شرکت رہتی ہے۔ فقہی موضوعات پر آپ کے بعض مقالات کے عنوانات اس طرح ہیں: عصرِ جدید میں اجتہاد کی معنویت ونوعیت، ضبطِ ولادت، انسانی مشکلات اور اسلامی شریعت، وقت کے سلگتے مسائل، اسلامی بینکوں کا طریقۂ کار۔ ملک و بیرونِ ملک سے آنے والے استفتاء کے جوابات بھی آپ تحریر کرتے ہیں، البتہ ان کا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

فیکلٹی کی جانب سے ۱۹۳۰ء میں طلبہ کی نصابی ضرورت کے پیش نظر چھ حصوں میں ''سلسلۂ دینیات'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی گئی تھی۔ اس کو اساتذہ کی مشترکہ کمیٹی نے مرتب کیا تھا۔ اس میں ارکانِ اربعہ کے علاوہ مسئلۂ طہارت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

فیکلٹی آف دینیات کے شعبۂ دینیات (شیعہ) کے تحت شیعہ مسلک کے اساتذۂ کرام نے بھی میدانِ فقہ میں تصنیفی خدمت انجام دی ہے۔ مولانا سید علی نقی نے ''زندہ سوالات'' اور ''سجدہ گاہ'' اور مولانا ذیشان حیدر جوادی نے ''اصول و فروع'' کے نام سے کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ مولانا سید منظور محسن نے علامہ حلّی کی عربی کتاب کا ترجمہ 'تبصرۃ المتعلمین' کے نام سے کیا ہے۔

۲۔ امارتِ شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار

خطۂ بہار کے اس جلیل القدر ادارہ نے ملک گیر سطح پر فقہ کے میدان میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ فقہ اور متعلقاتِ فقہ سے اس ادارے کی وابستگی تدریس و تصنیف کے علاوہ عملی نوعیت کی بھی ہے، جو اس ادارے کی امتیازی شان ہے۔ بنیادی طور پر یہ ادارہ فقہ کی تجربہ گاہ ہے۔ یہاں ''فضلاءِ مدارس'' کو مزید تربیت کے

سنگلاخ میدان سے گزار کر فقہ، فتویٰ اور قضا کا امیر اور نقیب بنا دیا جاتا ہے۔ اس ادارے کے قیام اور ضرورت کے احساس میں جمعیۃ العلماء ہند کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جمعیۃ العلماء کی اعلیٰ کمان پر فائز رہتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس ادارے کی سرپرستی فرمائی۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اس کی خشتِ اول رکھی۔ ۳۸ یہ ادارہ افتاء و قضاء کے دوسالہ نصاب کے ذریعہ فارغینِ مدارس کو اس کی تربیت و سلیقہ فراہم کرتا ہے۔ زیرِ تربیت طلبہ کے قیام و طعام کا معقول نظم ادارہ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ کورس مکمل کرنے کے بعد ان طلباء کو ملک کے طول و عرض میں شرعی پنچایتوں کی نگرانی اور دارالافتاء کے قیام وانصرام کے لیے مامور کیا جاتا ہے۔ اس طرح فنّی مہارت کو عمل کی تجربہ گاہ سے گزارنے کا مفید اور کارآمد سلسلہ جاری وساری ہے۔ دوسری طرف یہاں دارالافتاء و دارالقضاء الگ الگ قائم ہیں، جن کے فیصلے خاص طور پر بہار و اڑیسہ کے مسلمانوں کے لیے حکومت تسلیم کرتی ہے۔ تمام فتاویٰ اور قضیے تاریخ وار امارتِ شرعیہ کے رجسٹر میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ یہ ریکارڈ بک ہندوستان کی شرعی عدالتوں کے لیے سنگِ میل ثابت ہوسکتا ہے بشرطے کہ ادارہ کے ارباب اسے زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی سعی فرمالیں۔ اس ادارہ کو مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی خدمات حاصل رہیں۔ آپ صاحبِ نظر عالم اور وسیع النظر خادمِ ملت تھے۔ آپ نے ادارہ کو عالمی افق پر متعارف کرانے کی سعی فرمائی۔ تاحیات امارت شرعیہ اڑیسہ و بہار کے قاضی کے عہدے پر فائز رہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت بھی آخری وقت تک فرمائی۔ آپ کی فقہی تصنیفات میں ''قانونِ شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل'' نیز ''مسلم پرسنل لا کا مسئلہ نئے مرحلے میں'' کافی وقیع اور جامع ہیں۔ ادارے سے عملی طور پر وابستہ دوسرے جلیل القدر عالمِ دین مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تھے۔ آپ پوری زندگی اسم بامسمّیٰ رہے۔ آپ کی علمی و عملی کاوشیں ہندوستان کے فقہی افق پر روشن ستارہ کی مانند ہیں۔ آپ کا شمار آپ کی زندگی ہی میں اسلامی قانون کے ماہرین کی صفِ اول میں ہونے لگا تھا۔ آپ کی نمایاں خدمات میں اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی کا قیام ہے۔

امارتِ شرعیہ کو دیگر قابلِ قدر افراد کی خدمات حاصل رہی ہیں، جن میں مولانا مفتی انیس الرحمٰن قاسمی، مفتی جنید عالم قاسمی، اور مفتی جسیم الدین رحمانی وغیرہ کے اسماء گرامی لیے جاسکتے ہیں۔

امارتِ شرعیہ ایک ضابطہ اور نظم کے ساتھ مربوط ہے۔ انتظامی امور اور شرعی رہنمائی کا ذمہ دار شورائی عمل کے ذریعہ منتخب کیا جاتا ہے۔ جو ''امیرِ شریعت'' کہلاتا ہے۔ آج کل مولانا سید نظام الدین امیرِ شریعت ہیں۔ موصوف کی ژرف نگاہی کا اندازہ امارتِ شرعیہ میں پیش آمدہ پیچیدہ مسائل اور فقہ اکیڈمی کے مختلف علمی اجلاسوں میں اٹھائے جانے والے اعتراضات کے جوابات سے ہوتا ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلم مجلسِ مشاورت میں آپ کی شرکت سے ایک طرف فقہی مسائل کی عقدہ کشائی ہوتی ہے تو دوسری طرف شریعت کی حفاظت وصیانت میں آپ کی عملی جدّ و جہد اور تجربات سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ امارتِ شرعیہ کی جانب سے مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی دو کتابیں بعنوان ''ہندوستان اور مسئلۂ امارت'' نیز ''تاریخ امارت'' شائع ہوچکی ہیں۔ اس ادارے کا یہ امتیاز بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں سے خالص فقہی نوعیت کا رسالہ سہ ماہی بحث ونظر ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ بعد میں اس کی اشاعت اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی کی زیرِ نگرانی ہونے لگی۔ اس رسالہ کے مشمولات سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں: فسخِ نکاح، عقدِ اجارہ، عقدِ شرکت، دوسرے مذاہب پر فتویٰ، ہندوستان میں عشر وخراج کا حکم، فقہ حنبلی اور اس کی عمومی خصوصیات، فقہ شافعی اور اس کی اوّلیات وخصوصیات، فقہ مالکی اور اس کی خصوصیات، فقہِ اسلامی اور قانونِ روما (ملاحظہ کیجیے بحث ونظر کے مختلف شمارے ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۴ء)۔

امارتِ شرعیہ تصنیفی کاموں سے زیادہ عملی مسائل اور ان کے حل میں دلچسپی رکھتا ہے۔ جس کا مظاہرہ مسلم پرسنل لا کی حفاظت، مسلمانانِ بہار واڑیسہ کے عائلی وازدواجی تنازعات کے تصفیے اور رؤیت ہلال کی خبروں کی تصدیق کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔

۳۔ اسلامک فقہ اکیڈمی، دہلی:

اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام بنیادی طور پر مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے چیرمین ڈاکٹر منظور عالم کی مشترکہ کوششوں سے عمل میں آیا۔ اکیڈمی کو روزِ اول سے مختلف مسلک کے علماء کرام کے مفید مشورے اور تعاون حاصل رہا اور سب نے علاقائی، گروہی اور جماعتی تنگ نظری اور تعصّبات سے بلند ہوکر شریعت سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح اجتماعی اجتہاد کی فضا ہندوستان گیر پیمانے پر ابھری۔ فقہ اکیڈمی کے سمیناروں میں عالمِ اسلام کے معروف اساتذۂ فن شرکت فرماتے رہے ہیں۔ ابتداء میں اس ادارہ کا نام مرکز البحث العلمی تھا۔ اس کے پہلے بین الاقوامی سمینار (۱۹۸۹ء دہلی) کے بعد اس کا نام مجمع الفقہ الاسلامی (اسلامک فقہ اکیڈمی) تجویز کیا گیا۔ ۳۹ اب تک ہندوستان کے مختلف مقامات پر فقہ اکیڈمی کے تیرہ (۱۳) قومی/ بین الاقوامی سمینار منعقد ہو چکے ہیں۔ ہر سمینار میں تقریباً دو سو علماء کرام شرکت فرماتے ہیں۔ ان سمیناروں میں پیش کیے گئے مقالات، تجاویز اور فیصلے قاضی پبلشرز نئی دہلی نے 'مجلّہ فقہ اسلامی' کے نام سے الگ الگ دس جلدوں میں شائع کردیے ہیں۔ جن موضوعات پر یہ سمینار ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: ضبطِ ولادت، مکانوں اور دکانوں کی پگڑی، انسانی اعضاء کی پیوندکاری، کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت، موجودہ مالیاتی نظام، بینک کے سود کے مسائل، آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت، مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جانے والے غیر سودی بینک، بیت المال اور مسلم فنڈ کا شرعی نقطۂ نظر، تجارت میں رابطہ کی شکلیں اور حقوق یعنی رائٹس کی خرید وفروخت، دوملکوں کی کرنسی کا ادھار اور تبادلہ، موجودہ فسادزدہ ہندوستان میں بیمہ زندگی یعنی لائف انشورنس کی گنجائش، زکوٰۃ کے مصادر و مصارف، شیرز کے شرعی مسائل، زرعی زمینوں کی پیداوار کے مسائل، عشر وخراج، ضرورت اور حاجت کا تعین، مشینی ذبیحہ کی شرعی حیثیت، رؤیتِ ہلال، طبّی اخلاقیات اور ایڈس کی روک تھام کے لیے شرعی سفارشات اور

عورتوں کے حقوق کی حفاظت وضمانت کے لئے نکاح کے وقت کچھ اضافی شرطیں، قبضہ کرنے سے قبل خرید و فرخت کرنا، پانی میں زندہ مچھلی کی خرید و فروخت، راجستھان کے لیے اوقاتِ سحر، مختلف سرکای اداروں اور پرائیویٹ کمپنیوں میں حصہ لینے کی شکلیں، مسلم اوقاف کے مسائل، اوقاف کی ویران جائدادوں کی باز آبادکاری کے مسائل، حج وعمرہ کے مسائل، کلوننگ یعنی مصنوعی طریقہ پر اولاد پیدا کرنے کے مسائل، انقلابِ ماہیت، جبری شادی، اموالِ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری، انٹرنیٹ وجدید وسائلِ ابلاغ کے ذریعہ عقود و معاملات، اقلیات کے فقہی مسائل، وغیرہ۔ ان عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہ اکیڈمی نے کتنے اہم موضوعات چھیڑے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان سمیناروں میں دارالعلوم دیوبند، مظاہرِ علوم سہارن پور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، امارتِ شرعیہ پٹنہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ دارالسلام عمر آباد، جامعۂ نظامیہ حیدر آباد، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مدرسہ شاہی مراد آباد، دارالافتاء دارالعلوم گجرات، باقیات الصالحات ویلور، کے علاوہ کرناٹک، آندھرا پردیش، اتر پردیش اور بہار کے علماء شرکت فرماتے رہے ہیں۔ اس کے بین الاقوامی سمیناروں میں کویت، قطر، عراق، سعودی عربیہ اور بنگلہ دیش کے علماء کی مشارکت وسرپرستی رہی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علماء کرام کی ان علمی مجالس میں سیکولر اداروں کے فارغین اور اساتذہ کے علاوہ وکلاء، جج صاحبان اور ماہرینِ معاشیات نیز سائنسی علوم کے اسکالرس کی شرکت کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور علمی مباحثہ ومذاکرہ کے ذریعہ مختلف فیہ مسائل کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر تفصیلی مباحثہ کے بعد اجتماعی رائے بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فقہ اکیڈمی کی ان کوششوں سے اردو زبان وادب کی ترقی میں بھی ایک مخصوص پیش رفت ہوئی ہے، تاہم یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اب تک ان سمیناروں میں ہندوستان کے تمام مکاتبِ فکر کی خاطر خواہ شرکت نہیں ہوسکی ہے۔ اسی طرح عمرانیات، سماجیات، سیاسیات، قانون اور طب وغیرہ کے صفِ اول کے ماہرین اور اسکالرس کی شرکت برائے نام ہوئی ہے۔

۴۔ ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ:

اس ادارے کا باضابطہ قیام ایک آزاد ادارہ کی حیثیت سے ۱۹۸۱ء میں عمل میں آیا۔ اس سے قبل یہ جماعت اسلامی ہند کے شعبۂ تصنیف کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ جدید معاشرتی وتہذیبی مسائل کا احاطہ اس کے ترجیحی مقاصد میں شامل ہے۔ جماعت اسلامی ہند کی فقہی خدمات کے ضمن میں اس ادارے کی خدمات کو نمایاں طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے یہ ادارہ تصنیفی تربیت کے دوسالہ کورس کا اہتمام کرتا ہے۔ ادارہ کی لائبریری میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے مصادر کے علاوہ بڑی تعداد میں رسائل ومجلّات کے ذریعہ طلباء کے فکر وخیال میں وسعت اور انہیں اخذ واستفادہ کی مشق بہم پہنچائی جاتی ہے۔ تصنیفی تربیت پانے والے فارغینِ مدارس کو متعین وقت کے اندر مخصوص عنوان پر مقالہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح دوسال کے عرصہ میں ان میں تحقیقی مہارت، ارتکاز اور اختصاص پیدا ہوتا ہے۔ یہاں طلباء کو وظائف دیے جاتے ہیں اور ان کے لیے قیام کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (م ۱۹۹۹ء) اس ادارے کے بانی صدر تھے۔ آپ کی فقہی بصیرت جماعت اسلامی کا قیمتی سرمایہ تھی۔ آپ کی فقہی تصانیف میں نکاح کے اسلامی قوانین، یکساں سول کوڈ اور مسلمان، مسلم پرسنل لا دینی وملّی نقطۂ نظر سے، کے علاوہ شاہ ولی اللہؒ کی **الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف** کا ترجمہ ''اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ'' معروف ہیں۔ آپ کی تمام فقہی کتب میں علمی گہرائی، وسعت نظری اور اجتہادی ذوق کی جلوہ گری ہے۔

ادارہ کے بانی سکریٹری مولانا سید جلال الدین عمری (پیدائش ۱۹۳۵ء) جو ۲۰۰۱ء سے ادارہ کے صدر ہیں، ملک کی متنوع دینی، ملی، دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ نائب امیر جماعت اسلامی ہند، تاسیسی ممبر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ممبر مسلم مجلس مشاورت، مدیر سہ ماہی تحقیقات اسلامی جیسی گوناگوں ذمہ داریوں

اور ہمہ جہت عملی مصروفیات کے درمیان گراں قدر علمی خدمات انجام دینا آپ کے اوقات کی ضابطہ بندی اور اصولی زندگی کا درخشاں باب ہے۔ ان ذمہ داریوں کی وجہ سے زندگی کے مختلف میدانوں میں ملک وملت کو درپیش چیلنجز اور ان کے حل کی تدابیر نے آپ کے قلم میں وہ جاذبیت، اعتدال اور استحکام پیدا کردیا ہے جو دیگر فقہاء کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ مولانا کے فقہی تجزیے اور ان کی علمی آراء ان کی بیش تر تصنیفات میں ملتی ہیں۔ خاص طور پر صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، معروف ومنکر، عورت۔ اسلامی معاشرہ میں، مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ اور اسلام کا عائلی نظام اس سلسلے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ آپ کی متعدد کتب کا دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف فقہی موضوعات پر آپ کے بہت سے مقالات شائع ہوچکے ہیں، جیسے نکاح اور اس کی قانونی حیثیت، مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان ازدواجی تعلقات، غائب اور مفقود کی بیوی کا نفقہ، عورت کی سربراہی کا مسئلہ وغیرہ۔ مآخذِ شریعت سے بھرپور اخذ واستفادہ اور عصر جدید کے تقاضوں کی رعایت آپ کی فقہی تحریروں کا امتیاز ہیں۔

ادارۂ تحقیق کے تیسرے اہم رکن مولانا سلطان احمد اصلاحی (ولادت ۱۹۵۲ء) ہیں۔ آپ کی جملہ تحریریں فقہ ومتعلقاتِ فقہ کی ترجمان اور اجتہادی ذوق کا نمونہ ہیں۔ ان کے ذریعہ عصرِ جدید کے بعض پیچیدہ سماجی مسائل کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ مثلاً مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام، پردیس کی زندگی اور اسلام، کم سنی کی شادی اور اسلام، بچوں کی مزدوری اور اسلام، بندھوا مزدوری اور اسلام، اسلام کا نظریۂ جنس، شادی کی رسمیں اور اسلام۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ فقہی موضوعات پر آپ کے متعدد مقالات بھی شائع ہوئے ہیں، مثلاً جدید ذرائع ابلاغ اور اسلام، شریعت کا اصولِ عرف وعادت اور موجودہ حالات میں اس کی معنویت، زکوٰۃ کا مصرف فی سبیل اللہ اور دینی اداروں اور تحریکات کا مسئلہ، اسلامی زکوٰۃ انفرادی یا اجتماعی؟ وغیرہ، [۴۰]

۵۔ادارۂ مباحثِ فقہیہ دہلی:

یہ ادارہ اصلاً جمعیۃ العلماء ہند (۱۹۱۹ء) کی ایک علمی وفقہی شاخ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں مولانا محمد میاںؒ کی نگرانی میں اس کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کی شریعت کے مختلف مسائل کے ضمن میں رہنمائی کی جاتی رہی ہے۔ اس ادارے نے ملک گیر سطح کے چار بڑے فقہی سمینار ۱۹۹۱ء،۱۹۹۳ء اور۱۹۹۴ء، میں منعقد کیے ہیں۔ان سمیناروں کے موضوعات یہ تھے: غیر سودی رفاہی ادارے اور سوسائٹیاں، اسلامی نظامِ قضا اور ہندوستان، شیئرز وایکسپورٹ، دوسرے مسلک پر فتویٰ اور عمل کے حدود وشرائط۔ مذکورہ تمام موضوعات اس امر کے غمّاز ہیں کہ عصرِ جدید کی ضرورت اور تقاضوں کو محسوس کیا جارہا ہے، جمعیۃ العلماء ہند نے قیاس واجتہاد کی روش اختیار کر کے ہندوستان کی مسلم ملت کی رہنمائی کے سلسلہ میں ایک مثبت قدم اٹھایا ہے۔ضرورت ہے کہ اسے مزید توانائی فراہم کی جائے۔

ج۔اہلِ سنت والجماعت:

بیسویں صدی کے اس حنفی المسلک گروہ نے فقہ وفتاویٰ کے لیے ملک گیر سطح پر مدارس، دارالافتاء اور مراکزِ تربیت قائم کیے ہیں، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، جامعہ رضویہ، منظر عام اسلام بریلی، جامعہ رضویہ لائل پور پنجاب (پاکستان) جامعہ نعیمیہ مرادآباد وغیرہ کو اس مکتبِ فکر کے اہم علمی وفکری مراکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس مکتبِ فکر کو باضابطہ ملک گیر حیثیت انگریزوں کے آخری عہد میں حاصل ہوئی۔ تحریکِ خلاف ہندوستان کی برطانوی حکومت کی سخت مخالف تھی، لیکن اس کے بالکل برعکس مولانا احمد رضا خان بریلوی (م ۱۸۵۶ء) نے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا۔ مسائلِ فقہیہ میں مولانا احمد رضا خانؒ صاحب کا سخت گیر رویہ ۱۸۹۳ء کے بعد شروع ہوا، جب وہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی طلب کردہ ''ندوۃ العلماء'' کی میٹنگ سے ناراض ہوکر چلے آئے۔ انہیں علماءِ دیوبند سے سخت اختلاف تھا۔حتی کہ مولانا قاسم

نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، اور مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسی جلیل القدر ہستیوں کے متعلق انہوں نے قطعی کفر کے فتوے دیے۔[۴۱]

مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ اس مکتبِ فکر کے امام اعظم وفقیہ زماں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بعد کے دیگر ممتاز علماء میں مفتی امجد علیؒ، مولانا محمد نعیم مرادآبادیؒ، مفتی عبدالمنان اعظمیؒ، مولانا عبدالعزیز مرادآبادیؒ اور مولانا محمد سعید نوریؒ وغیرہ کے اسماء گرامی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ بعض مخصوص معتقدات واعمال کی وجہ سے یہ مکتبِ فکر اپنے کو دیگر احناف سے ممتاز و برتر سمجھتا ہے، مثلاً مرحوم بزرگوں سے وسیلہ چاہنا، ان سے دعا کی درخواست کرنا، ایصال ثواب کے لیے شیرینی کی تقسیم کے ساتھ اجتماعی طور پر قرآن خوانی کی تقریب عمل میں لانا، میلاد میں قیام کرنا اور حضور اکرم ﷺ کی موجودگی کا تصور کرنا، نذر و نیاز اور فاتحہ وقل، عرس وقوالی کا اہتمام کرنا، قبروں کو پختہ کرنا، ان کو زینت بخشنا، ان پر چادریں چڑھانا، اور تعزیہ داری وغیرہ، اس مکتبِ فکر کے اصحابِ قلم علماء نے اپنی فقہی تصنیفات میں ان مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، نیز الگ الگ عنوانات کے تحت ان پر کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور ادلّہ شرعیہ سے جواز وعدمِ جواز پر گفتگو کی ہے۔ اس مسلک کی نمائندہ کتابیں یہ ہیں: فتاویٰ رضویہ، اس کا اصل نام "العطایا النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویۃ" ہے، یہ بریلی، مبارک پور، بمبئی اور لاہور سے مختلف اوقات میں شائع ہو چکی ہے۔ مولانا احمد رضا کی دوسری اہم تصنیف احکامِ شریعت ہے۔ مولانا محمد امجد علی کی فتاویٰ امجدیہ (دوجلدیں) اور بہارِ شریعت (تین جلدیں) کے علاوہ مولانا خلیل احمد کی سنی بہشتی زیور بھی معروف فقہی دستاویز ہے۔ ذیل میں فتاویٰ رضویہ کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے:

فتاویٰ رضویہ کسی ایک دارالافتاء سے صادر ہونے والے فتاویٰ کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ مصنف کے مختلف رسائل کا مجموعہ ہے، جو استفتاء وافتاء کے انداز پر مرتب کی گئی ہے۔ مطبوعہ حصوں میں استفتاء کی مجموعی تعداد چار ہزار چار سو چھیانوے (۴۴۹۶) ہے۔ بعض مسائل میں امام مالکؒ کی آراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حنفی فقہ کی معتبر کتب حوالوں کے لیے استعمال کی گئی ہیں مثلاً درمختار، فتح القدیر، فتاویٰ ہندیہ،

البحر الرائق، قاضی خان، بدائع الصنائع، کنز العمال، نصب الرایہ، طحاوی اور جامع الرموز وغیرہ۔ فتاویٰ رضویہ کی تمام جلدوں میں مسائل درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کیے گئے ہیں: عقائد، طہارت، تیمّم، وضو، غسل، مساجد، روزہ، جنائز، حج، نکاح، وکالت، حدود، سیر، شکار و ذبیحہ، حظر و اباحت، مکروہات، فرائض و مستحبات، حرام و حلال وغیرہ۔ مختلف جلدوں میں فصول و ابواب کی تکرار پائی جاتی ہے۔ بہتر ہوتا کہ ایک نوعیت کے تمام مسائل یکجا کسی خاص جلد میں جمع کر دیے جاتے۔ اسی طرح اس کمی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ اس میں عصرِ جدید کے نئے مسائل کا ذکر برائے نام ہے۔

خلاصۂ بحث:

ہندوستان کے مدارسِ دینیہ اور مختلف دبستانِ علم و فضل کی گوناگوں فقہی سرگرمیوں کے اس سرسری جائزہ سے یہ بات بخوبی عیاں ہوجاتی ہے کہ فقہ اور متعلقاتِ فقہ کو اردو زبان کا جامہ پہنانے میں ان کا کردار کلیدی رہا ہے۔ مزید برآں یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں گذشتہ دو صدیوں کی فقہی تصنیفات نے قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا ہے۔ البتہ اس تلخ حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ فقہاء، مفتیان اور قضاۃ کی تربیت و تیاری نیز مخصوص عباداتی اور فروعی مسائل پر تصنیف و تالیف اور مختلف مسالک پر مبنی فتاویٰ کی کثرت سے عصرِ جدید کے تقاضوں سے نبرد آزمائی ممکن نہیں ہے۔ آج بنیادی طور پر، موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلکی، گروہی اور جماعتی تعصّبات کے تنگ دائروں سے بالاتر ہوکر اور قدیم طرزِ فکر کو چھوڑ کر عصرِ جدید کے مسائل اور تقاضوں کا ادراک کیا جائے۔ نیز شروح و حواشی پر انحصار کرنے کے بجائے بنیادی مآخذ شریعت کی طرف مراجعت کی جائے، تاکہ اجتماعی اجتہاد کی فضا ہموار ہو سکے اور آج کے زمینی مسائل کا حل تلاش کرنے میں آسانی ہو سکے۔

حواشی ومراجع:

۱۔ Narendra Nath Law, Promotion of Learning in India During Mohammadan Rule, London, 1916, p. 19

۲۔ خیر المجالس، مرتبہ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲، ۳۴

۳) فقیر محمد جھیلمی، الحدائق الحنفیہ، نول کشور لکھنؤ، ۱۹۰۶ء، ص: ۳۰۵، ۳۰۶، خلیق احمد نظامی، سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص ۳۸۹

۴) Elliot & Dewson, History of India as told by its own Historians, London, 1867, vol.III, p.576

۵۔ عبدالرشید (مرتب) فتوحاتِ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ، غیر مورخہ، ص ۱۶

۶۔ محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ (انگریزی ترجمہ) مطبع نول کشور، ۱۲۸۱ھ، ج اوّل، ص: ۳۴۸، ۳۵۲، ۵۶۲

۷۔ پروفیسر اکبر رحمانی، خاندیش میں مسلمانوں کی تعلیم، ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جولائی ۱۹۹۴ء ص: ۲۹-۳۱

۸۔ مولانا ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء کے مختلف ابواب، نیز دیکھئے ضیاء الدین اے ڈیسائی Centres of Islamic Learning in India, Publication Division., Ministry of Information & broadcasting, Govt. of India کے مختلف ابواب

۹۔ حوالۂ سابق

۱۰۔ ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ترجمہ صادق حسین، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۱۸۴-۱۸۶

۱۱۔ رفیق زکریا، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج وزوال، ترقی اردو بیورو، دہلی ۱۹۸۵ء، ص ۴۱

۱۲۔ یہاں شمالی ہند کے علمی مراکز ومدارس کا ذکر ہے جنوبی ہند کے مدارس اور ان کی علمی خدمات کی تفصیل کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔

۱۳؎ قاری محمد طیب، دارالعلوم کی صد سالہ زندگی، دیوبند، ۱۹۶۵ء، ص:۱۶

۱۴؎ دارالعلوم کی صد سالہ زندگی، ص:۳۶ تا ۳۹

۱۵؎ سید محبوب رضوی، تاریخ دیوبند، مطبوعہ اشوک پریس، دہلی ۱۳۱۲ھ ص ۱۳۱-۱۳۲، قاری محمد طیب کی مذکورہ کتاب میں ۱۹۷۴ء تک کے افتاء کا مکمل ریکارڈ ملتا ہے۔ بعد کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے دارالافتاء کے رجسٹر کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مزید دیکھیے ڈاکٹر شمس تبریز کا مقالہ بعنوان ''فتاویٰ دارالعلوم۔ ایک مستند فقہی مجموعہ''، سہ ماہی فکرِ اسلامی بستی، جولائی ۱۹۹۹ء تا جون ۲۰۰۰ء، معاصر فقہ اسلامی نمبر ص:۲۰۶

۱۶؎ منتخبات نظام الفتاویٰ، قاضی پبلشرز، دہلی، ۱۹۹۷ء، دوم ص:۱۰۴

۱۷؎ منتخبات نظام الفتاویٰ، اصلاحی کتب خانہ، دیوبند ۱۳۹۹ھ، اول ص:۱۸۵

۱۸؎ مولانا عطاء الرحمٰن، دارالعلوم کی فقہی خدمات، ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند مئی/ جون ۱۹۹۷ء

۱۹؎ محمد زکریا کاندھلوی، تاریخ مظاہر، کتب خانہ اشاعت العلوم، سہارن پور، ۱۳۹۲ھ، جلد اول، ص:۱۴، نیز دیکھیے سہ ماہی فکرِ اسلامی بستی، معاصر فقہ اسلامی نمبر ص:۲۱۴ بعنوان: فتاوی مظاہرِ علوم ایک تعارف از مولانا عبدالقدوس رومی

۲۰؎ تاریخ مظاہر ص:۷۲، ۷۵، ۷۷، ۸۰ تا ۸۱، ۹۳ تا ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۱۰۔

۲۱؎ سید محمد شاہد مظاہری، علماء مظاہرِ علوم سہارن پور اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات، کتب خانہ اشاعت العلوم سہارن پور ۱۹۸۳ء جلد اول، ص:۲۴۰

۲۲؎ سید محمد شاہد، علماء مظاہرِ علوم اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات، کتب خانہ اشاعت العلوم، سہارن پور ۱۹۸۳ء جلد اول، ص:۳۴۰

۲۳؎ محولہ بالا ص:۳۴۰ تا ۳۴۲

۲۴؎ ملاحظہ ہو مولانا عبدالقدوس رومی کا مقالہ بعنوان ''فتاوی مظاہرِ علوم۔ ایک تعارف'' سہ ماہی فکرِ اسلامی بستی، معاصر فقہ اسلامی نمبر، ص:۲۱۵

۲۵؎ علماء مظاہرِ علوم اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات، ص:۳۴۰ تا ۳۴۲

۲۶؎ شمس تبریز خان، تاریخ ندوۃ العلماء، دفتر نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۱۹۸۴ء، جلد دوم، پیش لفظ

۲۷؎ محمد اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام، پیش لفظ از عبدالماجد دریابادی،

مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء

۲۸ تاریخ ندوۃ العلماء، جلد اول ص: ۱۲۷

۲۹ حوالہ بالا ص: ۲۲۱

۳۰ عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی مختصر حیاتِ حمید، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء باب اول

۳۱ دستور جامعۃ الفلاح، شعبۂ نشر و اشاعت، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ، ۱۹۹۵ء

۳۲ دارالعلوم کی صد سالہ زندگی، ص: ۵۸

۳۳ شمس تبریز، صدر یار جنگ، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۲۷ء، ص: ۱۶۷

۳۴ قواعد و قوانین ٹرسٹیان، مسلمانانِ علی گڑھ، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۰ء، ص: ۳۳

۳۵ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، لاہور اکیڈمی پنجاب، ۱۹۵۷ء، ص: ۳۷۸

۳۶ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اپنی زندگی کے ایک بڑے حصہ میں ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستہ رہے اور کئی کتابیں دہلی میں رہتے ہوئے تالیف کیں۔ چوں کہ اس مقالہ میں تمام اداروں کا احاطہ ممکن نہیں اس لیے مولانا کی تمام فقہی تالیفات کا یکجا طور پر ذکر کر دیا گیا ہے۔

۳۷ مولانا تقی امینی کی فقہی خدمات پر ڈاکٹر قیصر حبیب کی نگرانی میں محترمہ رخسانہ کوثر صالحاتی پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ توقع ہے کہ اس تحقیقی مقالہ کے ذریعے مولانا کی فقہی خدمات کے مختلف پہلو سامنے آسکیں گے۔

۳۸ عبدالصمد رحمانی، تاریخ امارت، مراد پور پٹنہ، ۱۹۴۳ء، باب اول

۳۹ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مجلہ فقہ اسلامی، جلد اول، خطبۂ استقبالیہ، اسلامک فقہ اکیڈمی، دہلی ۱۹۸۸ء، نیز دیکھیے مولانا عتیق احمد قاسمی کا مقالہ بعنوان ''فقہ اکیڈمی انڈیا: پس منظر، مقاصد، خدمات'' شائع شدہ سہ ماہی فکرِ اسلامی بستی، معاصر فقہ اسلامی نمبر، ص: ۳۵۷

۴۰ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کی فقہی خدمات کے تعارف کے لیے ملاحظہ کیجیے: محمد رضی الاسلام ندوی کا مقالہ بعنوان ''ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کی فقہی خدمات'' شائع شدہ سہ ماہی فکرِ اسلامی بستی، معاصر فقہ اسلامی نمبر، ص: ۳۸۷۔۳۹۹

۴۱ جمیل احمد نذیری، رضاخانیت کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ صداقت، مبارکپور، ۱۹۸۶ء کے مختلف ابواب

ترجمہ و تلخیص

بیسویں صدی میں برصغیر کا عربی ادب

ڈاکٹر احمد ادریس مصری/
پروفیسر محمد حسان خان

لندن کے ایک سفر میں، برصغیر کے عربی ادب پر ایک لیکچر کی تیاری کے دوران 'اسکول برائے دراسات مشرق و افریقہ' کی لائبریری کی فہرست میں عربی ادب پر ایک نہایت اہم کتاب نظر آئی۔ اس کا عنوان دیکھ کر ہی خوشی ہوئی، کیوں کہ برِّصغیر کے عربی ادب پر یہ کسی عرب کی لکھی کتاب تھی۔ پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مصنف نے تنقید و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے: **الأدب العربي في شبه القارة الهندية حتىٰ أواخر القرن العشرين** ۔ اس کے مصنف ڈاکٹر احمد ادریس مصری ہیں جو اردو زبان کے ماہر ہیں۔ مصر، پوری عرب دنیا میں علم و معرفت اور ثقافت و تہذیب کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس نے اردو زبان کی اہمیت اور وسعت کے پیش نظر بہت پہلے سے اپنی یونیورسٹیوں میں اردو شعبے قائم کر رکھے ہیں۔ اس وقت پانچ یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اردو ہیں۔ فارغ طلبہ کو دو سال کے لیے پاکستان بھیجا جاتا ہے، جہاں وہ اردو زبان میں مزید مہارت پیدا کرتے ہیں۔ آج اردو کتابوں کا بہت ادبی اور خوب صورت ترجمہ یہ مصری ماہرینِ اردو کر رہے ہیں۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کی جاسکتی ہے: ۶ شارع عباس فہمی سباتس، الھرم، جمھوریۃ مصرالعربیۃ۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ عربی ادب کے ہندوستانی ماہرین اس کتاب سے بے خبر ہیں، حالاں کہ یہ ۱۹۹۳ء میں طبع ہوئی ہے۔

یہ کتاب متوسط تقطیع پر ۴۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ کہیں بڑے ابواب ہیں، ا۔نثر، ۲۔نظم، ۳۔مشہور ہندوستانی عربی ادباء کی حیات۔ آخر میں خاتمہ اور حوالے ہیں۔

پہلے باب میں، جو''برِصغیر کے عربی ادب کی خصوصیات'' سے موسوم ہے، درج ذیل ذیلی ابواب ہیں: **النحو والصرف ، علوم اللغة ، المعاجم ، علوم البلاغة، الإنشاء والرسائل، المقامات ، الطرائف، الأمثال، الحيل اللفظية اور الترجمات الأدبية۔**

دوسرے باب میں ، جو''برِصغیر میں عربی شاعری کی خصوصیات'' سے معنون ہے، درج ذیل ذیلی ابواب ہیں:

شعراء من أصحاب الدواوين، شعراء بلا دواوين، شروح الشعر ، الشعر القصصي والتاريخي، نظم العلوم، العارضات الشعرية، الرسائل الشعرية اورالعروض والقوافي"۔

ڈاکٹر احمد ادریس بہت دل پذیر انداز میں تمہید باندھتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرا جی چاہتا ہے کہ پانچ سو یا ایک ہزار عرب اسکالر برصغیر کے سارے کتب خانے آپس میں تقسیم کرلیں اور ان ہزاروں کتابوں سے دھول جھاڑ کر ان سے استفادہ کریں، جنھیں علماء نے اس وقت تحریر کیا تھا جب یہ تینوں ملک (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش) ایک تھے۔ بادشاہ اسلام کے نام پر حکومت کرتے تھے۔ اور وہ جلیل القدر علماء جو منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں، انہوں نے اسلام پھیلایا۔ ان کی تھوڑی بہت محفوظ کتابیں ببانگ دہل اعلان کررہی ہیں کہ عربی زبان ہر اس جگہ ہے، جہاں قرآن پاک کا نور پہنچا۔ اگر قرآن پاک نہ ہوتا تو عربی زبان آباء واجداد کے ساتھ ان کی قبروں میں دفن ہوگئی ہوتی۔

مصنف نے ان ہندو مالکانِ پریس کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جنھوں نے عربی واسلامی کتب کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا، چاہے ان کا مقصد تجارت ہی رہا ہو۔ وہ تحریر کرتے ہیں: ''انہوں نے، جب کہ مشینیں بالکل ابتدائی انداز کی تھیں، چھپائی کے لیے بڑا جوکھم اٹھایا، اسلامی وعربی علوم کی نشرواشاعت میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔ کوئی بھی شریف اور انصاف پسند شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا''

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف کے لیے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام

آباد کی لائبریری کھنگال ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر انہوں نے کتاب لکھنے سے پہلے لاہور، ملتان، کراچی، پشاور اور پاکستان کی دیگر لائبریریوں اور رامپور، دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، حیدرآباد اور ہندوستان کی سینکڑوں لائبریریوں سے استفادہ کر کے یہ کتاب لکھی ہوتی تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی ضخامت کا کیا عالم ہوتا''۔

مصنف نے ادب کے بارے میں ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ وہ یہ کہ ادب کیا ہے؟ وہ تحریر کرتے ہیں کہ دورِ قدیم اور دورِ جدید میں بہت سے عرب و مسلم ادباء کے نزدیک جو کچھ عربی میں تحریر کیا گیا وہ عربی ادب ہے، لیکن اسے قبول کرنا آسان نہیں ہے۔ پھر ہر مصنف نے کئی کئی کتابیں تحریر کی ہیں، جیسے نواب صدیق حسن خاںؒ (م ۱۳۰۷ھ) نے ۵۶ کتابیں، شیخ احمد رضا خان بریلویؒ (م ۱۳۴۰ھ) نے ۳۰۰ کتابیں، شیخ عبد الحی لکھنویؒ (م ۱۳۰۴ھ) نے ۸۶ کتابیں، شیخ اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ) نے ۱۳ کتابیں لکھی ہیں، تو کس طرح برصغیر کے ہزاروں ادباء پر علمی کام ہوسکتا ہے؟

عربی ادب کا یہ وسیع مفہوم اسلامی ثقافت کا مترادف ہے۔ اس کی تدوین و تنقید میں عمریں ختم ہو جائیں گی، اور یہ تحقیق کسی ایک کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ اس لیے مصنف نے اپنی کتاب سے وہ سب خارج کر دیا جس کا تعلق خالص اسلامیات کے مطالعہ اور رجال وطبقات وغیرہ سے ہے۔ اور اپنی کتاب کو شعر و نثر کے اس حصہ تک محدود رکھا ہے جس کا تعلق عربی زبان و ادب اور اس سے متعلق فنون، جیسے نحو وصرف، علم لغت، معاجم، انشاء و بلاغت، مقامات اور امثال وغیرہ سے ہے۔ تفسیر میں صرف ابو الفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ) کی ''سواطع الالہام'' کو شامل کیا ہے، اس لیے کہ اس میں صنعتِ اھمال کا استعمال ہوا ہے۔

مصنف نے برِصغیر کے ادباء سے ہندو پاک کے عرب ادباء مراد لیے ہیں، وہ ادباء جن کے آباء و اجداد عرب ہجرت کر گئے تھے اور وہ وہاں پیدا ہوئے، جیسے ابن اعرابی، ابو الغراف اسلمی، اعشی ھمدان، المنتجع بن نبہان اور کشاجم محمود بن الحسن، ان کو ہندوستانی نہیں مانا ہے۔ وہ ادباء بھی اس میں شامل نہیں ہیں جن کا تعلق عربوں

سے تھا اور وہ ہندوستان میں کسی بادشاہ یا نواب کے دربار سے جڑ گئے تھے۔ اسی طرح وہ ادباء بھی اس فہرست سے خارج قرار دیے گئے ہیں جو کسی دربار میں رہے، پھر یہیں قیام کر لیا۔ وہ عرب ادباء بھی اس فہرست میں شامل نہیں ہیں جو یہاں کچھ مدت رہے، جیسے البحتری، ذوالرمۃ، منصور بن حاتم النحوی وغیرہ۔ مصنف نے صرف ان ادباء کو شامل کیا ہے جن کی اصل ہندوستانی ہے، جو یہیں پیدا ہوئے اور پرورش پائی، چاہے بعد میں وہ عرب چلے گئے ہوں جیسے صغانی، مرتضٰی الزبیدی وغیرہ۔

یہ حد بندی اور تقسیم صرف فنّی ہے تاکہ برِّصغیر کا ادب بالکل ممتاز کیا جا سکے۔

برِّصغیر کے ادب کی خصوصیات

ہر ادب کی کچھ بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں، جن سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ مصنفِ کتاب نے پورے ایک باب میں ان خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے:

پہلی خصوصیت

اس دب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایسا ادب ہے جس میں عربوں نے براہِ راست کوئی حصہ نہیں لیا اور ہندوستانیوں نے اس کو عربوں سے بلا واسطہ حاصل نہیں کیا، بلکہ اپنی طرح دوسرے عجمیوں سے لیا ہے۔ یہ عربی ادب ایرانیوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ برِصغیر کے عربی ادب کی یہ سب سے اہم خصوصیت ہے۔

اس کی تاریخی تفصیل یہ ہے کہ سندھ میں عربوں کی فتوحات وغزوات کے وہ اثرات نہیں ہوئے جن کا ذکر مؤرخین نے بڑے مبالغہ سے کیا ہے۔ عرب و ہند کے تعلقات اسلام سے بہت پہلے سے تھے۔ مؤرخین نے اس سے اہمال برتا ہے۔ جب ان تعلقات پر قلم اٹھایا تو اس کو شر اور کفر و فسق سمجھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اس دور کی تاریخ ضائع ہوگئی اور ادب پر تأثیر اور تأثر واضح نہ ہو سکا۔ مصنف اس کی مزید تفصیل جاننے کے لیے عربوں کی قدیم تاریخ کا مطالعہ ضروری قرار دیتے ہیں۔

اس طرح مؤرخین نے مبالغہ سے کام لے کر اسلام سے پہلے کے دور کو

براثابت کیا اوراس دور کی اچھائیوں سے اعراض کیا۔عربوں اور دیگر اقوام کے قدیم تعلقات کو چنداں اہمیت نہیں دی۔ جنگ وغزوات کے ذکر میں بھی مبالغہ سے کام لیا۔ محمد بن قاسم کے غزوۂ سندھ کے بارے میں بھی اسی طرح مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس کی طرف یہ بات منسوب کی کہ اس نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی اور عربی زبان کورائج کیا۔مثال کے طور پر عبدالمنعم النمر کی 'تاریخ الاسلام فی الھند' مطبوعہ مصر ۱۹۵۹ء، محمد طیب النجار کی کتاب 'تاریخ العالم الإسلامی' مطبوعہ جدہ ۱۹۸۵ء، بلاذری کی 'فتوح البلدان' مطبوعہ لیدن ۱۸۶۶ء، ڈاکٹر جمیل احمد کی 'حرکة التألیف باللغة العربیة' اور قاضی اطہر مبارک پوری کی تألیفات کا آپ مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

حجّاج، جس نے لاکھوں مسلمانوں کا قتل کیا، اس کو دین کی پروا تھی نہ شریعت کی۔اس کو بیرونِ عرب اسلام پھیلانے کی کیا فکر ہوسکتی ہے؟ حجاج کے احوال کے لیے ابن کثیر کی 'البدایة والنهایة' مطبوعہ بیروت ۱۹۸۸ء کا مطالعہ بہت مفید ہے۔محمد بن قاسم کا رویہ سندھ میں ایک داعی کا رویّہ نہ تھا جس کا مقصد اسلام پھیلانا ہوتا ہے۔روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سندھ پر حجاج کا حملہ اسلام اور عربی زبان اور تہذیب کی نشر واشاعت کے لیے نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد بنی ہاشم کے بھاگے ہوئے لوگوں کا پیچھا کرنا اور انہیں پکڑنا تھا۔ [۱]

خود اموی سلطنت کی پالیسی اسلامی نہ تھی۔عربوں کو عجمیوں پر فضیلت دی جاتی تھی۔اس لیے بیرون اور اندرونِ خلافت عجمیوں کے دل اموی حکومت سے دُور تھے۔

اگر محمد بن قاسم نے ہندوستان میں خیر کا کام کیا ہوتا تو ولید کے بعد سلیمان ابن عبد الملک اس کو معزول کرتا نہ عراق کے شہر واسط میں اس کو قید کرتا اور سخت ایذائیں دیتا، یہاں تک کہ وہ مرگیا۔

سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چند عرب خاندان: الماھانیة سنجان میں، الھباریة منصورة میں، السامیة ملتان میں، العدانیة مکران میں، اور المھلبة قصدار میں جا کر آباد ہوگئے، جیسا کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے۔ [۲]

حقیقت یہ ہے کہ برِصغیر میں اسلام کی نشر و اشاعت کے نتیجے میں عربی زبان کی اشاعت بہت کم ہوئی، بلکہ اس کے دیگر اسباب ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض حکمرانوں نے، جیسے نویں صدی میں ساحلِ مالابار کے شاہ زامورین نے، مسلمانوں کی طاقت ور حکومت سے دوستی کے ذریعے اپنے مفادات کی حفاظت چاہی۔ اس نے اپنے ملک کے تمام مچھلی پکڑنے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے بچوں میں سے ایک یادو کی اسلامی طریقہ پر پرورش کریں۔[۳] ممکن ہے یہ طریقہ ہندوستان کے دیگر بادشاہوں نے بھی اپنایا ہو۔ جیسا کہ چھوٹی مملکتیں بالعموم بڑی اور عظیم طاقتوں سے تعلقات کے لیے کرتی ہیں۔

اسلامی مملکت کی اٹھان اور ترقی کے زمانہ میں ہندوستانی حکومت میں ضعف و اضمحلال آ گیا تھا، کیوں کہ اس وقت ہندو، بدھ اور جینیوں کے درمیان لڑائی جھگڑا برابر جاری تھا۔ سوسائٹی منقسم ہو چکی تھی۔ یہ لوگ اپنے مذہب سے بے زار اور کسی نئے دین کی تلاش میں تھے، اور وہ اس عظیم الشان خلافت کے دین کو جاننا چاہتے تھے جس کے بیچ میں سمندر حائل ہے اور اس طرف جانے والے اچھی اچھی خبریں لاتے ہیں۔[۴]

اسلام اور عربی زبان کی اشاعت کے دو اہم اسباب اور بھی ہیں: ان میں سے ایک ہے فارس اور ماوراء النہر کے علماء و فضلاء کی سکون و اطمینان کی تلاش میں بڑے پیمانہ پر ہجرت۔

عباسی خلافت کی کمزوری کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی مملکتوں اور نوابیوں کا قیام اور پھر خلافتِ عباسیہ کے سقوط، بغداد کی تباہی، اسلامی ثقافت کی بربادی اور اسلامی علوم اور اسلامی تصنیفات کی ناقدری کے بعد علماء کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ شمال سے جنوب کی طرف ہجرت کر جائیں۔ یہ مملکتیں گیارھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک قائم ہوتی رہیں، جن میں سے بعض بڑی زبردست اور علم و علماء کی قدرداں تھیں، جیسے غزنوی، غوری اور مغل سلطنتیں۔ ان ممالک میں بڑے بڑے دینی مدرسے قائم ہوئے، جہاں طلبہ نے علمِ دین حاصل کیا۔

دوسری وجہ بلادِ فارس کے علم ومعروفت کے شیوخ اور اساطین کی آمد و رفت ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں غزنوی سلطنت کے زمانے سے پندرھویں صدی تک یہ اساطین برابر ہندوستان کی سیاحت کرتے رہے۔ شیخ ہجویریؒ، شیخ اسماعیل بخاریؒ، فرید الدین العطارؒ، معین الدین چشتیؒ، جلال الدین تبریزیؒ، جلال الدین بخاریؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، عبدالکریم جیلیؒ جو ابن عربیؒ کے شاگرد تھے، میر شاہ الجیلانیؒ، بہاء الدین زکریاؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ، جلال الدین سرخ پوشؒ وغیرہ۔ ۵

برصغیر میں عربی ادب پر عربی زبان کے براہ راست اثرات جنوبی ہند میں ساحلِ مالابار پر ہوئے ہیں، جہاں حجّاج کے ظلم سے بھاگ کر چند عرب خاندان آباد ہوگئے تھے۔ بعد میں عہدِ عباسی میں تاجروں کے قافلے پے در پے آتے رہے اور اپنے اثرات ڈالتے رہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس تأثیر کے حوالے ہم تک بہت کم پہنچے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس سلسلے کے بھرپور مراجع اور حوالے علاقائی زبانوں میں نہ ہوں گے۔ کوئی دیدہ ور اسکالر چاہے تو انہیں تلاش کرسکتا ہے۔ یہاں جس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ مالابار کے ادب کے نمونے عربی تأثیر کے اجتماعی نمونے ہیں جن کا مطالعہ ایک ادبی مظہر اور نمونے کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔ برخلاف شمالی برِصغیر کے، جہاں اغلب عربی ادب فارسی ثقافت سے متأثر ہے۔ اس کے باوجود عربی کا بلاواسطہ اثر انفرادی حیثیت میں پایا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں، جن کو عموماً عربوں کے ماحول اور سوسائٹی میں رہنے کا موقع ملتا ہے، ان کا اسلوب دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، جیسا کہ نثر پر گفتگو کرتے وقت یا رضی الدین صغانی، مرتضٰی زبیدی اور عبدالعزیز میمن پر کلام کرتے ہوئے ہم بتائیں گے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ تأثیر حالات کے مطابق ہر فرد میں علاحدہ پائی جاتی رہی ہے۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شمال کے ادباء کی تخلیقات پر عموماً فارسی اثرات غالب رہے، جب کہ جنوب کے اغلب ادب پر عربی ادب کی تأثیر پائی جاتی ہے۔

خود ہندوستانی اور یورپی علماء اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام اور عربی زبان وادب نے فارس کے راستے سے ہند کے بڑے حصہ پر قبضہ کیا۔

عبداللہ مبشّر الطرازی کہتے ہیں: ''عربوں کا ہند پر پہلا بحری حملہ عمر بن الخطابؓ کے عہد میں گورنرِ بحرین عثمان بن ابی العاص کی سرکردگی میں ہوا۔ یہ حملہ خلیفہ کے حکم کے بغیر ہوا۔ اس لیے حضرت عمرؓ بہت ناراض ہوئے۔ بعد میں انھوں نے ہند فتح کرنے کی اجازت زمینی راہ سے یعنی براہِ فارس دے دی۔ ۶

مولانا عبدالحی حسنی تحریر کرتے ہیں: ''ہندوستان میں اسلام خراسان اور ماوراء النہر سے آیا اور وہیں کی علمی شعائیں ہندستان پر پڑیں''۔ ۷

گوستاف لوبون کہتے ہیں: ''پہلے مسلمان حملہ آور افغان، ترک اور مغل تھے۔ عرب جو محمد ﷺ کے اول متبعین میں سے تھے، انہوں نے ہندوستان میں اپنی کالونیاں قائم نہیں کیں۔ اکثر اپنے ملک سے بحرِ عمان پار کر کے تجارت کی غرض سے ہندوستان آتے اور اپنے اسٹور قائم کرتے اور مغربی ساحل پر، جہاں نہرِ سندھ سمندر میں ملتی ہے، لوگوں کی املاک پر زبردستی قبضہ کر لیتے۔☆ ۸

ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوستان میں درحقیقت وہ عرب تہذیب منتقل کی جس میں فارس کے عوام کے اختلاط کی وجہ سے بعض تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اور مسلمانوں نے اپنے ساتھ ہندوستان میں قدیم عرب ملکوں کی سیاست بھی داخل کی جس میں اچھائیاں بھی تھیں، ساتھ میں ایسی برائیاں بھی تھیں جس سے تہذیب کو زوال آتا ہے۔

یہ جملۂ معترضہ ہم نے اس لیے پیش کیا کہ مطالعہ کرنے والوں کے درمیان یہ بات عام ہے کہ محمد بن قاسم نے برِصغیر میں عربی زبان اور اسلام پھیلایا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان، عجمیوں کے ذریعہ، جب انہوں نے اسلام پھیلایا تو پھیلی ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم نے یوں بھی ضروری سمجھی کہ آئندہ صفحات میں ہمیں برصغیر کے عربی ادب کی خصوصیات پر گفتگو کرنی ہے۔ ہم کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اس ادب کی کیا اہمیت ہے؟ کن چیزوں نے اس پر اثر ڈالا ہے؟ عربوں کو اس بات کی بہت قدر دانی ہے کہ یہ ادب خالصاً عجمیوں کا تخلیق کردہ ہے جس میں

☆ یہ ایک جاہلانہ بات ہے۔ ان تاجروں کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ دوسروں کی املاک پر زبردستی قبضہ کرلیں۔ (مدیر)

عربوں کا کوئی اثر نہیں ہے۔

مصنف عربوں کے طریقۂ انصاف کے مطابق بڑی اچھی بات تحریر کرتے ہیں۔عربوں سے زیادہ مستشرقین اور ہندوؤں نے عربی زبان اور اس کی کتابوں کو عام کیا۔منشی نول کشور ایک ہندو شخص ہے جس نے تقریباً چار ہزار کتابیں چھاپیں جن میں سے اکثر عربی اور فارسی کی ہیں۔

جس شخص کو ان حقیقتوں کی تلاش ہو اس کو ڈاکٹر احمد خان کے مقالہ ''برصغیر میں عربی کتب عام کرنے میں علماء کا حصہ'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔اس مقالہ میں موصوف نے ہند میں طباعت کی ابتداء، مستشرقین کے کارناموں اور ہندو پاک کے علمی اداروں نے عربی ثقافت کو پھیلانے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ اس کا تذکرہ کیا ہے۔یہ مقالہ کویت کے بین الاقوامی میلے میں نومبر ۱۹۹۳ء میں پڑھا گیا تھا۔(ڈاکٹر احمد خان بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبۂ احیاء ثقافتِ اسلامی کے ڈائریکٹر ہیں۔انہوں نے اپنا یہ مقالہ اس میلے میں شرکت کے لیے جانے سے پہلے مجھے دکھایا تھا)

ادباء میں سے بعض نے بلا تکلف فارسی کو واسطہ بنایا ہے۔محمد زماں خان (م۱۹۹۲ء) اپنی کتاب **سفینة البلاغة فی صناعة الانشاء والرسائل** کے مقدمے میں کہتے ہیں: ''میں نے جہاں ضرورت محسوس کی، ترتیبِ کلام بدل دی اور بعض کو مقصد حاصل کرنے کے لیے مختصر کر دیا۔اسی طرح میں نے بعض مطالب کو فارسی سے نقل کیا اور یوں میں فارسی اور عربی دانوں کے بیچ میں ترجمان بن گیا'' [۹]

بعض ادباء ایسے ہیں جنہوں نے فارسی نظم کو عربی نظم سے ملا دیا ہے۔جیسے محمد عباس تستری (م۱۳۰۶ھ) نے اپنے منظومہ ''اجناس الجناس'' میں اور احمد رسول پوری (م۱۳۵۹ھ) نے کیا ہے۔

بعض ادباء وہ ہیں جنہوں نے فارسی محسنات و بدائع نقل کئے ہیں اور وہ ان سے بہت متاثر ہیں۔یہاں تک کہ ان کے شعر عربی زبان اور عربوں کے مزاج کے بالکل خلاف ہو گئے ہیں، جیسے غلام علی آزاد بلگرامی (م۱۲۰۰ھ)۔

اسلام آباد میں ستمبر ۱۹۹۳ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس'' ایران اور

برِصغیر کے درمیان ثقافتی روابط'' کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں پیش کردہ مقالے دوحصوں میں چھپے ہیں۔ ان میں بہت سے اہم گوشے زیرِ بحث آئے ہیں۔ جس کو اس سلسلہ میں مزید معلومات درکار ہوں وہ ان کا مطالعہ کرسکتا ہے۔

ہم یہاں صرف ڈاکٹر ساجد اللہ تفہیمی، اعلیٰ جنتی اور غلام سرور کے مقالوں کا تذکرہ کریں گے۔ ان تینوں مقالوں سے ہمارے دعوے کی زبردست تائید ہوتی ہے۔[۱۰]

ہندوستان کے ماحول وادب پر فارسی کا کتنا زیادہ اثر ہے اس کا اندازہ ہم استاذ احمد کلچین کی کتاب ''کاروانِ ہند'' سے، جو دو بڑے حصوں میں چھپی ہے، کرسکتے ہیں۔ اس میں انہوں نے ان فارسی شعراء کی ایک فہرست پیش کی ہے جو صفوی دور میں ادب سے دلچسپی میں کمی اور دیگر نامناسب حالات کی وجہ سے ہندوستان ہجرت کرگئے تھے۔ اس فہرست میں آٹھ سو شعراء کا نام درج ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران کے ادباء وعلماء کی ہجرت کا برِصغیر پر بہت زیادہ اثر پڑا ہے۔ عربی زبان وادب کے پھیلنے کا یہ بڑا سبب ہے۔ یہ بات عرب علماء وادباء کو حاصل نہ تھی، کیوں کہ وہ اس علاقہ سے کٹے ہوئے تھے، اس لیے عام طور پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔

دوسری خصوصیت

برِصغیر کے عربی ادب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلامی مطالعاتی مراکز اور دینی مدارس کے درمیان پروان چڑھا ہے۔ اسی لیے ہم ان ادبی کتابوں کی تحریر کردہ شرحیں دیکھتے ہیں جو علماء نے ادب میں مقرر کر رکھی تھیں، جیسے معلقات، دیوان المتنبي، مقامات الحريري، المطوّل، الكافية، الشافية، ديوان الحماسة، قصائد البردة وبانت سعاد اور ألفية ابن مالک، حالاں کہ بدیع الزماں جیسا بلند پایہ ادیب محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان آیا، اس کی شہرت ہوئی، اس کے رسائل ومقامات علماء وادباء کی نظروں کے سامنے تھے۔ ان کا انتقال ۳۹۸ھ میں ہوا۔ ان کے مقابلہ میں حریری بہت بعد کے ہیں۔ ان کا انتقال ۵۱۶ھ میں ہوا۔ ان کا بہت چرچا ہے، لیکن بدیع الزماں کے مقامات، اشعار یا رسائل